دو عظیم اُردو شعراء کی فارسی شاعری

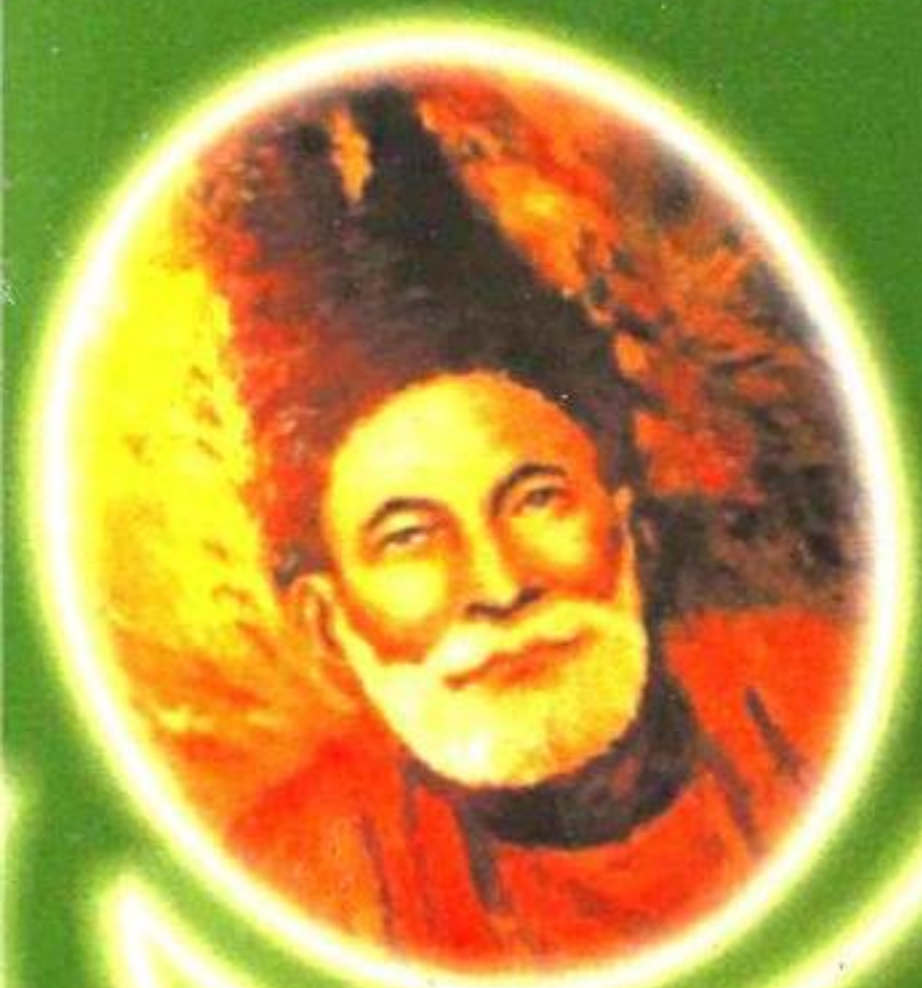

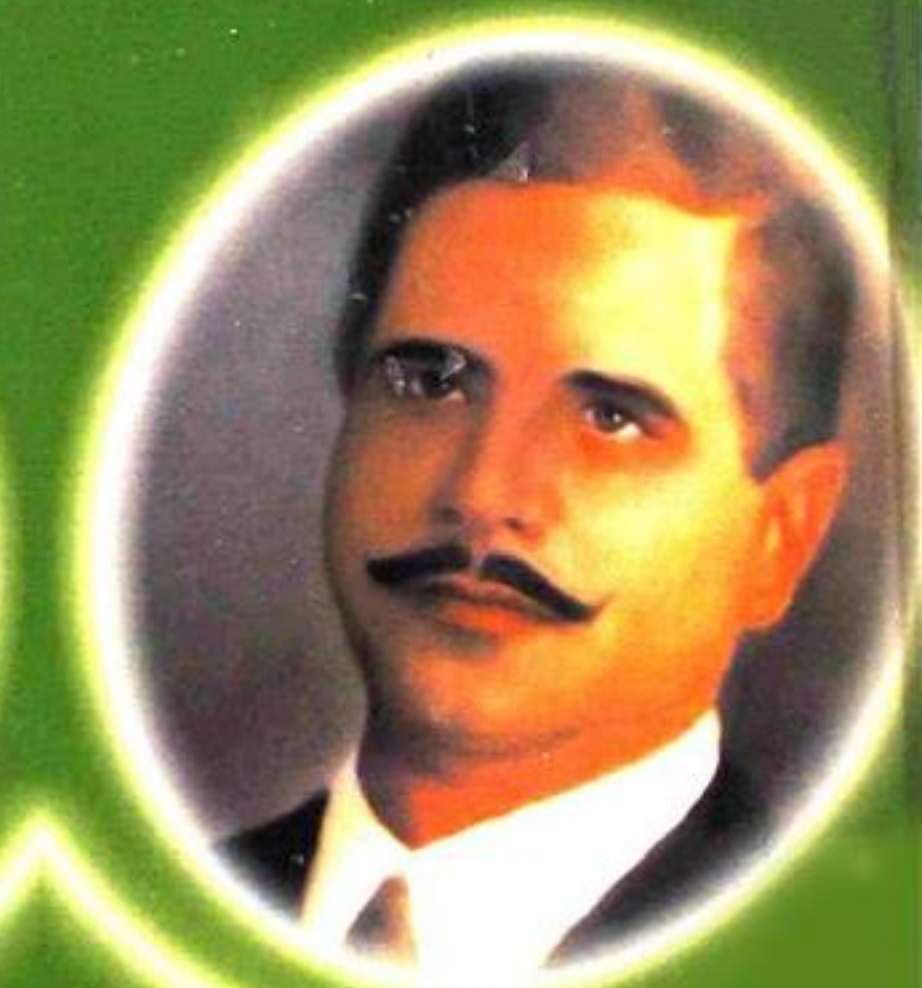

ڈاکٹر عبدالرشید خان

(گولڈ میڈلسٹ)

ذکی انٹرنیشنل پبلشرز دہلی

سلسلۂ مطبوعات ذکریٰ انٹرنیشنل پبلشرز، دہلی ۱۳۷

دو عظیم اُردو شعراء کی فارسی شاعری

مصنف
ڈاکٹر عبدالرشید خان
(گولڈ میڈلسٹ)

ذکریٰ انٹرنیشنل پبلشرز دہلی
وحید کتب مارکیٹ، ۵۲۳، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

Do Azeem Urdu Shoara Ki Farsi Shairi

by

Dr. Abdul Rashid Khan (Gold Medalist)

ISBN 93-81007-72-1

Peer Reviewed

ناشر _____ ذکریٰ انٹرنیشنل پبلشرز، ۵۲۳، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

باہتمام _____ سعید اختر خاں یوسفی

کمپوزنگ _____ TFC سینٹر، سری نگر 0194-2473818

مطبوعہ _____ ایم۔آر۔آفسیٹ پریس، دہلی

قیمت _____ Rs.300/- (عام ایڈیشن)

_____ Rs.500/- (لائبریری ایڈیشن)

باراول _____ ۲۰۱۰ء

Do Azeem Urdu Shoara Ki Farsi Shairi

by : Dr. Abdul Rashid Khan

ZIKRA International Publishers, Delhi

Waheed Kutub Market,
523, Matia Mahal, Jama Masjid,
Delhi - 110 006

Tel.: 91-11-6570 8480
Fax: 91-11-2325 1294
E-mail : info@zikraip.com

Telefax : 91-11-2328 2395
Cellular : 0-93500 00589
Website : http://www.zikraip.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	دیباچہ (پروفیسر محمد ظفر الدین)	05
۲	تقریظ (پروفیسر بشیر احمد نحوی)	07
۳	اظہارِ خیال	09
۴	غالبؔ کی فارسی شاعری	13
۵	علامہ اقبالؒ کی فارسی شاعری	59

❁❁❁

انتساب

مرزا غالبؒ کے نام

جنہوں نے مہد سے لے کر لحد تک مصیبتوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دکھ، غم اور پریشانی کا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کیا

اور

علامہ اقبالؒ کے نام

جن کا دل ملتِ اسلامیہ کی فکر میں ہمیشہ غمناک اور آنکھیں نمناک رہتی تھیں۔

دیباچہ

ڈاکٹر عبدالرشید خان اُردو زبان وادب کے شناور ہیں مگر فارسی اُن کے لیے عشقِ اوّل کے مترادف ہے۔ وہ اُردو کے درس و تدریس میں مصروف ہیں لیکن بچوں کو فارسی کی حکایات سناتے ہیں' فارسی ضرب المثال سے استفادہ کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر فارسی اشعار گنگناتے ہیں۔ دراصل اُنہوں نے پہلے پہل فارسی کو میدانِ عمل کے لیے مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا لیکن جلد ہی اُردو کی شیرینی و دلکشی نے اُنہیں اپنی جانب متوجہ کرلیا اور پھر وہ اُردو ہی کے ہوکر رہ گئے۔ اہلِ ایران اصفہان کو ''نصف جہان'' سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر عبدالرشید اُردو اور فارسی کے رشتوں میں اسی نصف جہان کی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کا اصرار ہے اور دُرست ہے کہ فارسی سے کما حقہ واقفیت کے بغیر اُردو کی چاشنی سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ فارسی مصادر' محاورے' تہذیبی وراثت' معاشرتی پس منظر اور زبان کے سیاق کی تفہیم کے بغیر اُردو کی تدریس ادھوری ادھوری سی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً یہی احساس ہے کہ اُنہوں نے اپنے خصوصی مطالعے کے لیے اُردو کے دو ایسے شعرا کا انتخاب کیا جنہوں نے فارسی شعری ادب میں بھی بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ میری مراد مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ سے ہے۔ دُنیائے علم و ادب میں غالب کی شناخت اُردو شاعر کی حیثیت سے قائم و دائم ہے۔ حالانکہ وہ عمر بھر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے رہے اور فارسی دانی و فارسی گوئی کو باعث افتخار سمجھتے رہے۔ غالباً عوامی زندگی سے فارسی کا چلن اُٹھ جانے کی وجہ سے اُن کی فارسی شاعری کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جس کی وہ حقدار تھی۔ البتہ زبان و ادب کے ماہرین علمی سطح پر اُن کی فارسی شاعری کو آج بھی وہی بلند درجہ عطا کرتے

ہیں جہاں اُسے ہونا چاہیے تھا۔ اِسی طرح علامہ اقبال نے بھی اُردو کے ساتھ فارسی میں اپنا جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے وہ بہ اعتبار کیفیت و کمیت قدر و منزلت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے ان دونوں شعرا کے فارسی کلام کو موضوع بحث بنایا ہے اور عام فہم زبان میں مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ اُنہوں نے کوشش کی ہے کہ قارئین اُردو شاعر کی حیثیت سے بنیادی پہچان رکھنے والے دو اہم شعرا کی فارسی شاعری سے واقف ہو سکیں۔ اُنہوں نے طلبا و طالبات کی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلیس، رواں اور سہل پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اور دونوں شعرا کے فارسی کلام کی پیش کشی اور اُن کی تفسیر و تعبیر کے ذریعے قارئین کو اُن کی شاعری سے قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید خان کا شیوہ رہا ہے کہ وہ عموماً ایسے موضوعات پر کتابیں تحریر کرتے ہیں جن کی اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اس سے اُن کے تعمیری ذہن اور جذبۂ خلوص و خدمت کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی سابقہ تصانیف ورق ورق ادب، سرمایہ اُردو، ذخیرہ اُردو اور لفظ لفظ اُردو اسی زمرے کی کتابیں ہیں۔ افادی کتب ہونے کی وجہ سے اُن کی اکثر کتابوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر عبدالرشید کی زیر نظر تصنیف بھی شہرت و مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس سے طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ عام قاری بھی استفادہ کریں گے اور دو عظیم شعرا کے نسبتاً کم نمایاں پہلو سے واقف ہو سکیں گے۔

پروفیسر محمد ظفرالدین
ڈین، اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تقریظ

اُردو اور فارسی زبان و ادب کو مرزا غالبؔ اور علامہ اقبال جیسے نابغات عصر پر ہمیشہ فخر حاصل رہے گا۔ مغلوں نے ہندوستان کو اگر غالبؔ اور تاج محل دیا، تو ملتِ اسلامیہ نے دنیا کو دانشورِ اقبال کے آفاقی اور اعلیٰ انسانی تصورات و تخیلات دیئے۔ زمانہ جس قدر آگے بڑھتا چلا جائے گا غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار و نظریات کی معنویت و افادیت اُسی قدر بڑھتی رہے گی۔ غالبؔ نے رنگِ تغزل میں جہانِ معانی جہاں آباد کئے تو اقبال نے اپنی فکر کی وسعتوں اور قلندرانہ اداؤں سے ایک فکری انقلاب برپا کیا۔ دونوں عظیم شعراء غالبؔ اور اقبال کے کروڑوں شیدائی علم و ادب کی دنیا میں موجود ہیں اور آئے دن دونوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید خان جو اُردو کے ایک فعال اور متحرک استاد مانے

ہیں، فارسی زبان وادب پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔خان صاحب نے ''اُردو کے دو عظیم شعراء کی فارسی شاعری'' میں فکری اور فنی دونوں حیثیتوں میں غالب اور اقبال کے درمیان قدر مشترک تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں برگزیدہ شعراء کی شعری وسعتوں کا احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔توقع ہے کہ فارسی شعروادب کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
پروفیسر اقبال انسٹی ٹیوٹ
کشمیر یونیورسٹی

اظہارِ خیال

سرزمین ہند پر مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی فارسی کا سورج طلوع ہوا۔اس کی شعاعوں کی تمازت سے آہستہ آہستہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد متحرک ہوکر اس نئی زبان کی طرف متوجہ ہوئی۔تاریخ کے مطابق فارسی چوتھی صدی ہجری میں واردِ ہند ہوئی اور یہ زبان صدیوں تک رابطے کی زبان رہنے کے علاوہ سرکاری دفتروں میں مستعمل رہی۔ چنانچہ ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے وقت محمد بن قاسم کے ساتھ لشکر میں شامل سپاہیوں کا تعلق مختلف علاقوں کے ساتھ تھا۔ان میں سے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد فارسی زبان بولتی تھی۔نویں صدی عیسوی میں ایرانی نژاد یعقوب بن لیث کو سندھ کا حکمران بننے کا موقعہ ملا۔ان کے عہد میں فارسی کو پنپنے کا شاندار موقعہ ہاتھ آیا۔غزنوی دور تک پہنچتے پہنچتے اس زبان کا دائرۂ اثر وسیع ہو چکا تھا لیکن عہد غزنوی میں فارسی ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مغلیہ دور میں اس زبان کی جڑیں بہت مضبوط ہوئیں اور برگزیدہ ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کی معرکۃ الآراء تخلیقات نے اس زبان کے ادب کو مالا مال کیا۔انگریزوں کے واردِ ہند ہونے کے ساتھ ہی انگریزی زبان یہاں کی سرکاری زبان بن گئی۔اس کے باوجود فارسی زبان کو بڑی دیر تک سرکاری، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی مقام حاصل رہا۔

غیر ملکی زبان ہونے کے باوجود بھی سرزمین ہند کے جن مفکروں نے فارسی زبان وادب کی طرف اپنی توجہ مبذول کی انہوں نے عالمی سطح پر اپنی ذہانت اور لیاقت کا مظاہرہ کیا۔ حضرت امیر خسرو، غنی کاشمیری، شیخ یعقوب صرفی کاشمیری،

اسد اللہ خان غالب اور ڈاکٹر علامہ اقبالؒ چند ایسے نام ہیں جن کو ایران کے برگزیدہ شعراء کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ غالب کو اگرچہ دنیائے ادب ایک اُردو شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کا راز ان کی فارسی شاعری اور نثر نگاری میں مضمر ہے۔ وہ خود اس بات کے معترف ہیں کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جاننے اور پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی فارسی شاعری میں نقشہای رنگ رنگ کا نظارہ کیا جائے ؎

فارسی بین تا بینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر اس مجموعہ اُردو کہ بے رنگِ من است

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اگرچہ اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز اُردو میں شعر گوئی سے کیا لیکن بین الاقوامی سطح پر اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے ان کو یہ زبان ناکافی معلوم ہوئی۔ نتیجتاً انہوں نے یورپ سے واپسی پر فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ اقبال نے اپنی فارسی شاعری کو فن کے بجائے تحریک کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی فارسی شاعری نے مسلمانوں کے خفتہ اذہان کو جھنجوڑنے میں نمایاں کردار نبھایا۔

غالب اور اقبال کی فارسی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا مقصد ان کی فنکاری یا فلسفیانہ افکار کی موشگافی کرنا نہیں ہے بلکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھنے والے طلباء اور طالبات کو ان دو عظیم سخنوروں کی فارسی شاعری سے کسی حد تک جانکاری دلوانا ہے کیونکہ آج کل کے اکثر اُردو دان ان کی اس عظمت سے بڑی حد تک نابلد ہیں۔ مجھے اُمید ہے یہ تصنیف غالب اور اقبال کی فارسی شاعری سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

مصنف

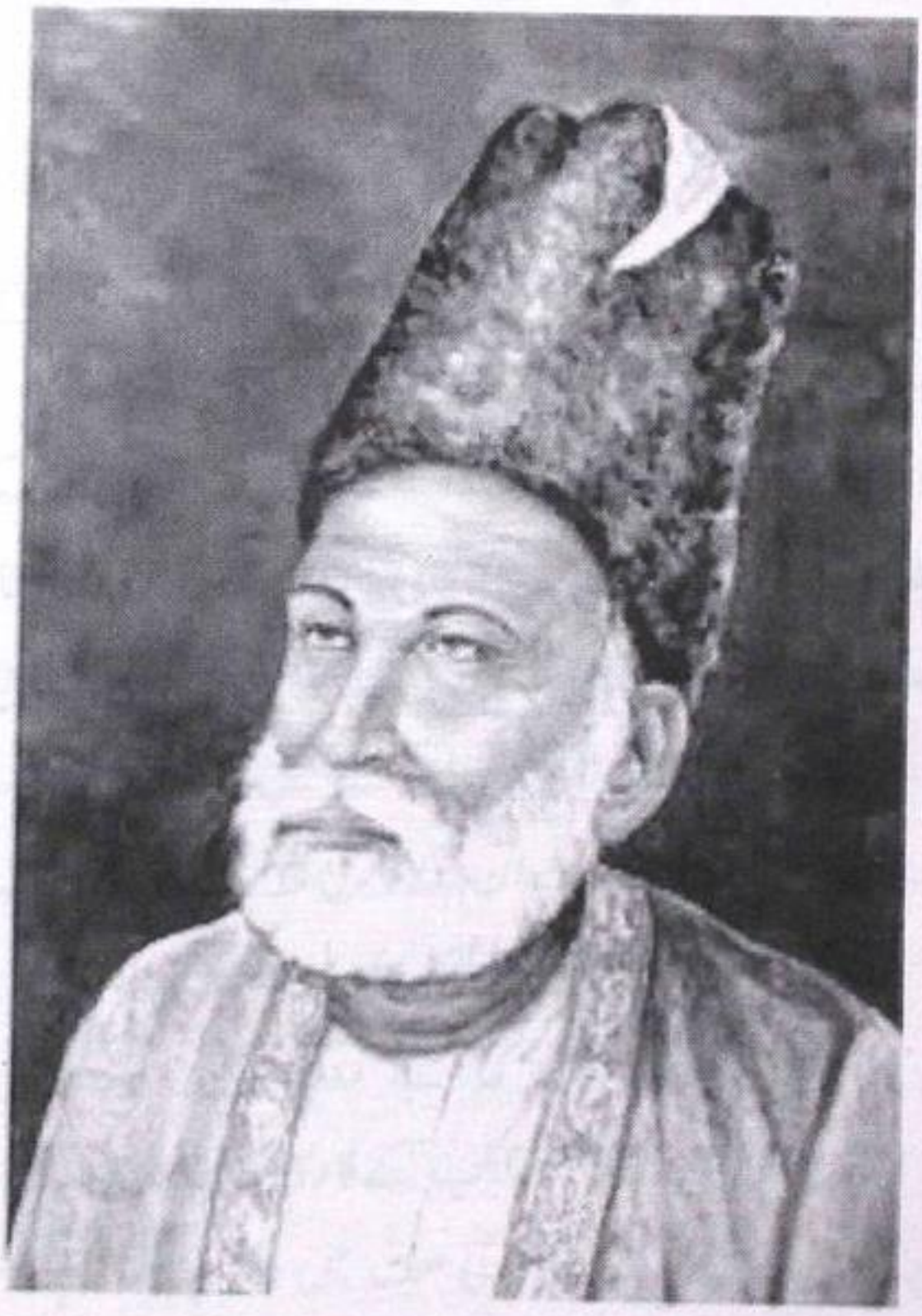

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

مرزا غالبؔ کی فارسی شاعری

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ مرزا اسد اللہ خان غالب اور اُردو زبان دو لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ اُردو نے غالب کو شہرتِ عام اور بقائے دوام عطا کی جبکہ غالب نے اُردو کو حیاتِ جاویداں بخش دی۔ اگر چہ دنیائے ادب میں غالب کی پہچان اُردو شاعر کی حیثیت سے ہوئی ہے لیکن ان کے ادبی قدوقامت کا سہی اندازہ لگانے کے لیے ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ غالب خود اپنی فارسی شاعری کو اُردو شاعری پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ دنیائے ادب سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان کے تخلیق کردہ نقشہای رنگ رنگ سے جانکاری حاصل کرنے کے لیے ان کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں۔

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

''اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے فارسی کلام کو فارسی کے درجہ اول کے شعراء کے کلام کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ غالب فارسی کلام کی بعض اصناف میں ہندوستانی، خراسانی اور تورانی فارسی کے عظیم شعرا کے ہم پلہ ہیں۔ امیر خسرو، حسن سخبری، فیضی، نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر، صائب، حزین، بیدل اور اقبال وغیرہ برصغیر کے نامور فارسی شعرا سے

غالب کا کلام کسی درجہ کم نہیں''۔[1]

Gopi Chand Narang اپنی کتاب "URDU: Readings in Literary Prose" میں فارسی کے ساتھ غالب کی والہانہ محبت سے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"Ghalib wrote more in Persian than in Urdu. He considered his Persian poetry and prose to be more important and, in fact, wished to be Judged by his Persian works. Although he is rightly accepted as the last classical persian poet of India, he is more loved and remembered for his urdu works. He was precocious and started writing poetry when he was barely ten. For a time he was fond of excessive imitation of Persian poets especially Bedil (died 1720), and wrote higly persianized and obscure poetry. This was criticized and parodied by his contemporasies. By the age of twenty five, he, on the advice of some of his friends, discorded much scholastic verse that offended good taste. After having discovered his style, Ghalib wrote with effortless abandon in much simpler and purer language"

غالب کو فارسی زبان ورثے میں ملی ہے۔اُن کے دادا مرزا توقان بیگ نسلاً تورانی تھے اور سمرقند میں سکونت کرتے تھے۔تلاش معاش کے سلسلے میں انہوں نے سمرقند سے ہجرت کر کے ہندوستان کا رخ کیا۔شروع میں وہ لاہور

کے نواب الملک کے ہاں ملازم ہوے اور بعد میں عہد عالمگیر میں دہلی پہنچے۔ دہلی چھوڑ کر جے پور روانہ ہوئے اور مہاراجہ کے ہاں ملازم ہوئے۔ بعدازاں آگرہ میں مکمل سکونت اختیار کی۔ ان کے ہاں دہلی میں میرزا عبداللہ بیگ خان نام کا ایک فرزند تولد ہوئے جن کی شادی آگرہ میں خواجہ غلام حسین خان کی صاحبزادی عزت النسا بیگم کے ساتھ طے پائی۔ اسی جوڑے نے ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء کو غالب کو جنم دیا۔ غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے ایک مکتب میں حاصل کی جو مولوی معظم مرحوم چلاتے تھے۔ جہاں تک غالب کی فارسی خوانی کا تعلق ہے اس بارے میں روایت ہے کہ ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی اہل فضل وکمال ان کی تربیت کرتے تھے اور ان ہی کی وساطت سے غالب نے عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کی۔

''پارسی نژاد فرزانہ ای بود از تخمۂ ساسانیان۔ پس از گرد آوردنِ دانش، کیش اسلام گذیدہ وخودرا عبدالصمد نامیدہ درسال یکہزار و دویست وبیست و شش (1226) ہجری بہ طریق سیاحت بہ ہند آمدہ و بہ اکبرآباد کہ پیکر پذیرفتن وخرد آموختن من ہم درآن شہر خجستہ بھر بودہ است۔ دوسال بہ کلبۂ احزان من آسودہ است ومن آیین معنی آفرینی وکیش یگانہ بیتی از وی فرا گرفتہ ام''[۲]

غالب نے اگرچہ ایران کے فارسی شعرا کی اتباع کی لیکن ان کو وثوق کے ساتھ کسی کا شاگرد نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اُردو شاعری میں غالب نے میر تقی میر اور شیخ امام بخش کی پیروی کی لیکن فارسی شاعری میں وہ کسی کی پیروی تسلیم نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اس میں اپنے ذوق فطری کو ہی سببِ تحریک قرار دیتے

ہیں۔

''اگر چہ غالب درشعر فارسی تتبع شاعران ایرانی رفتہ ولی درحقیقت نمی توان او را شاگرد کسی خواند۔ وی درشعراردوی خویش از میر تقی میر وشیخ امام بخش پیروی می کرد۔ ودرآغاز شعر اردوی خودرا بہ اہل فنِ نشان می داد ولی درشعرفارسی خویش کسی را موردِ مشورت قرار نہ داد وتنہا از ذوق فطری خویش کمک گرفت واین فن راخود حاصل کردو بہ مرحلۂ کمال رسانید'' [۳]

غالب اُردو کے بجائے اپنے فارسی کلام کو ہی گرانقدر سرمایہ سمجھتے تھے حالانکہ عبدالرحمٰن بجنوری نے ان کے مجموعۂ اُردو کو ہی ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب قرار دیا ہے۔ غالب کواس بات کا کافی دکھ تھا کہ لوگوں نے ان کی فارسی شاعری کی داد نہیں دی۔ غالب کی فارسی شاعری عوام کی عدم توجہی کی شکار اس لیے ہوئی کہ مغل دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی درباداری رو بزوال ہونے کی وجہ سے فارسی زبان کی شمع بھی آخری سانس لے رہی تھی اور اُردو فارسی کا نعم البدل بن کرا بھر رہی تھی۔ حالات کے پیش نظر اگر چہ غالب نے بھی اُردو میں اپنے کمالات کی نمائش کی لیکن ان کوفطری طور پر فارسی کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ وہ اُردو کے برگزیدہ شاعروں کے بجائے فارسی کے عظیم شعرا کی صف میں شمار ہونا چاہتے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ زندگی میں نہ سہی لیکن بعداز مرگ لوگ ان کی فارسی شاعری کی بڑی قدر کریں گے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

فارسی کلام کی قدرشناسی نہ ہونے کے نتیجے میں غالب سرزمین ہند سے

دل برداشتہ ہوئے تھے وہ اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ وہ اصفہان میں زندگی بسر کرے اور نجف میں دفن ہو۔

غالب از ہندوستان بگریز فرصت مفت تست
در نجف مردن خوش است و در صفاہان زیستن

ہندوستانی ماحول میں کمالات حاصل کرنے کے باوجود غالب طوطی ہندوستان ہونے کے بجائے گلستانِ عجم کا بُلبُل ہونے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

بود غالب عندلیبی از گلستانِ عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستان نامیدمش

غالب نے شروع میں مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگ میں لکھنا شروع کیا جس کے نتیجے میں ان کا کلام مشکل پسندی کا شکار ہوا لیکن دہلی آنے کے بعد ان کے ایک خیرخواہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے بیدل کا رنگ ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ غالب نے یہ مشورہ تسلیم کر کے فارسی کے دیگر شہرت یافتہ شعرا یعنی عرفی شیرازی، طالب آملی نظیریؔ اور ظہوریؔ کی پیروی شروع کی۔

پرفیسر نورالحق انصاری اپنی کتاب ''فارسی کتاب بعہد اورنگ زیب'' میں رقمطراز ہیں کہ غالب کے متعدد شعروں کا سرچشمہ نعمت خان عالی کے اشعار کو بتایا جاتا ہے۔ نعمت خان عالی ہندوستان کے فارسی ادیبوں اور شاعروں میں سب سے بڑے طنز نگار اور ہجونویس تھے۔ اس کا اعتراف غالب نے خود کیا ہے۔

''میری طبیعت جو ایک سروش غیبی ہے۔ ابتداء میں بھی خوب کہتی اور چیزوں کو تلاش کر لیتی تھی، لیکن میں اپنی آزاد روی

کے باعث کبھی کبھی ان لوگوں کے پیچھے بھی چلنے لگتا تھا جو خود راستہ سے ناواقف تھے اور اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان لوگوں کی کج روی کو ان کے مستانہ چال سمجھتا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں جو لوگ مجھ سے آگے نکل گئے تھے ان کو مجھ پر رحم آ گیا کیونکہ انہوں نے مجھ میں اپنی ہمراہی کی استعداد دیکھی تھی، وہ مجھ پر مہربان ہو گئے اور میری آوارہ گردی پر رحم کھا کر بہت شفقت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ شیخ علی حزیںؔ نے مسکرا کر مجھے میری گمراہی سے آگاہ کیا۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی نے مجھ پر ایسی زہر آلود نگاہ ڈالی کہ جس سے کج روی کا وہ مادہ جل گیا جو میرے پاؤں میں تھا۔ ظہوری نے بڑی محبت اور شفقت سے میرے بازو پر تعویذ اور کمر میں کچھ زادِ راہ باندھا اور نظیری نے مجھ کو اپنی خاص رفتار سکھائی''۔[۴]

غالب کی شاعرانہ عظمت کی ایک اہم وصف یہ ہے کہ انہوں نے تمام اصنافِ سخن یعنی قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، اور قطعہ پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنفِ سخن میں اپنی فنکاری سے گلہای رنگ رنگ کھلاتے ہیں۔ غالب کے فارسی کلیات میں غزلیات کی کل تعداد ۳۳۴ ہے۔ ان کی غزلیات میں حسبِ روایت مضامین موجود ہیں یعنی گل و بلبل، شراب و شباب، ہجر و وصال، حسن و جمال وغیرہ۔ ان کے یہاں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چونکہ جدت طرازی غالب کی ایک نمایاں وصف ہے لہٰذا ان کی غزلیات میں جدت طرازی کی عمدہ مثالیں پائی جاتی ہیں۔ وہ پرانی شراب کو نئی بوتل میں پیش کرنے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ غالب کی شاعری ان کے ذاتی

احساسات، تجربات اور مشاہدات کا بیان ہے۔ ان کی زندگی ناکامی اور نامرادی کا مجموعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیات میں سوز وتاثیر بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ مصائب اور مشکلات کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہیں بلکہ ناموافق حالات کے سامنے سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔

اُردو محبوب کی طرح غالب کا فارسی محبوب بھی سنگدل ہے۔ وہ اُس کے انتظار میں تڑپتا ضرور ہے لیکن ایک خاص لذت کے ساتھ۔ وہ ہجر کے قیامت خیز ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے باوجود اپنے محبوب کو فقط اس لیے مدعو کرتے ہیں تاکہ وہ غالب کے جوشِ تمنا کا بخوبی اندازہ لگا سکے۔

بیا و جوش تمنای دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگان چکیدنم بنگر

ترجمہ: آ میرے محبوب اور آپ کو دیکھنے کی میری تمنا دیکھ۔ اور نوکِ پلک سے آنسوں ٹپکنے کا منظر دیکھ۔

اگر ہوای تماشای گُلستاں داری
بیا و عالمِ در خون تپیدنم بنگر

ترجمہ: میرے محبوب اگر گلستان کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو۔ تو آ اور خون میں میرا تڑپنا دیکھ۔

غالب لذت پرستی میں یقین رکھتے تھے۔ وہ ایک سے زیادہ محبوبوں کے ساتھ دل لگی میں سکون قلب اور راحتِ جان محسوس کرتے تھے۔ وہ بیک وقت دلی کی ڈومنی اور بنارس کی لمبی پلکوں والی بنتِ حوا کے ساتھ لذت اندوز ہونے کی سعی کرتے تھے۔

''غالب لذت پرست تھے۔ وہ آگ کے شعلوں پر رقصِ خس سے بھی مزے لیتے تھے۔ زخم جگر کے نمکدان میں ڈوب جانے سے بھی لذت یاب ہوتے تھے اور پارہ ہای دل پر تمنا کی چوٹ لگ جانے سے بھی محظوظ ہوتے تھے اور یہ چیز ان کی اس وجدانی کیفیت کا نتیجہ تھی جو عشق سے ماوراء تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن کا عنصر جو غالب کے جذبۂ لذت پرستی کے لیے تازیانے کا کام دیتا ہے۔ غالب کے کلام میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ غالب کی حُسن پرستی مشرق کی روایتی حُسن پرستی نہیں کہ ایک سے زیادہ محبوبوں پر جان ودل نچھاور نہ کیے جائیں۔ وہ اس حیثیت سے بھی روایت شکن تھے کہ انہوں نے مادی حُسن کا جہاں کہیں بھی مشاہدہ کیا وہاں اس سے لذت اندوز ہوئے خواہ وہ دلی کی ستم پیشہ ڈومنی تھی خواہ بنارس کے قیامت قامت اور مژگان دراز محبوب'' [۵]

غالب محبوب کی سنگدلی اور بے اعتنائی دیکھ کر نا اُمید نہیں ہوتے ہیں۔ محبوب کے ساتھ محبت ان کے دل وجگر میں اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ پس از مرگ بھی اس کا وجود قائم رہے گا۔ وہ اگر چہ دنیا میں اپنی من پسند حسیناؤں کی قُربت پانے میں ناکام بھی رہے لیکن قیامت کے دن ان کو ان سے ہمکنار ہونے کی پوری اُمید ہے کیونکہ اہلِ جنت کی خدمت کے لیے ان ہی حسیناؤں کو بطورِ حور منتخب کیا جائے گا۔

ان پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدر حق.....

غالب محبوب کے انتظار میں کیا کچھ انتظام نہیں کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس انتظام کی تیاری میں ان کی پوری زندگی کام آئے گی۔ انتظام مکمل ہونے کے باوجود بھی غالب کا مہمان کی تشریف آوری ناممکن ثابت ہو جاتی ہے۔ اتنی بڑی ناکامی کے باوجود بھی غالب پشیمان اور پریشان نہیں ہیں۔ البتہ وہ انتظار کی تھکا دینے والی کاروائی بیان کرتے کرتے ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں۔

دمید دانہ و بالید و آشیانگاہ شد
در انتظار ہُما دام چیدنم بنگر

ترجمہ: ''میں نے دانہ بویا، دانہ اُگ گیا اور اس میں گھونسلہ بننے کی گنجائش پیدا ہوئی۔ ہُما کے انتظار میں میرے جال پھیلانے کا انداز دیکھو''

صنعتِ تلمیح کا استعمال ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے لیکن غالب نے یہ صنعت برتنے میں جو انداز اپنایا ہے وہ بالکل نرالا ہے۔ اُن کی تلمیحات میں تاریخ ساز واقعات کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے۔ نمرود کی آگ میں حضرت ابراہیمؑ کا نہ جلنا ایک اہم تاریخی واقعہ ہے لیکن غالب کا بغیر آگ کے جلنا ان کی فنکاری کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

شنیدۂ کہ بآتش نہ سوخت ابراہیم
ببین کہ بی شرر وشعلہ می توانم سوخت

غالب کا محبوب حسین و جمیل ہے لیکن وہ اپنے حسن و جمال کی عظمت کو بالکل محسوس نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا اُس کو احساس دلانے کی ضرورت ہے۔ غالب کے لیے محبوب کی صورت معانی سے پُر ہے جن کو سوائے غالب کے کوئی بیان نہیں کر سکتا ہے کیونکہ ان معانی کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

لختی آئنہ برابر نہ و صورت بنگر
پارہ ای گوش بمن دار و معانی بشنو

ترجمہ: ''غالب محبوب سے کہتے ہیں! ذرا آئینہ اپنے سامنے لے آؤ اور اپنی صورت کو اس میں دیکھتے جاؤ، ساتھ ہی میری طرف بھی دھیان رکھو اور اپنی صورت کے معنی مجھ سے سنتے جاؤ''

موسیقی سے کلام غالب میں ایک خاص قسم کی دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ موسیقی پیدا کرنے کے لیے وہ کبھی مترنم بحور استعمال کرتے ہیں اور ان بحور کے زیر و بم میں لطیف تشبیہات خوبصورت استعارے اور دلنشین حسن تعلیل بروئے کار لاتے ہیں۔ غالب نے فارسی غزل گوئی میں مشہور فارسی شعرا عرفی اور نظیری کا انداز اپنایا ہے۔ غالب کی غزلوں کا وجد آفرین تخیل اور رعنائی اور سرمستی سب عرفی اور نظیری کی یاد دلاتی ہے۔

ایجاز کلام غالب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ وہ فقط چند لفظوں پر مشتمل مختصر شعر میں معانی کی ایک وسیع و عریض دنیا پیش کرتے ہیں۔ اُن کے بعض مختصر اشعار دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ غزل ان کی مختصر نویسی کا عمدہ ثبوت پیش کرتی ہے۔

بیا و جوش تمنّای دیدنم بنگر
چو اشک از سرِ مژگان چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا اُمیدنیم
ندیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیانگاہ شد
در انتظار ہُما دام چیدنم بنگر
نیاز مندی حسرت کشاں نمی دانی
نگاہِ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
اگر ہوای تماشای گلستان داری
بیآ و عالمِ در خون تپیدنم بنگر
تواضعی نکُنم بی تواضعی غالب
بسایۂ خمِ تیغش خمیدنم بنگر

☆☆☆

شوخی اور ظرافت کلامِ غالب کی پہچان ہے۔ بقول حالؔی ظرافت ان کے مزاج میں اس قدر تھی کہ ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ غالب بذلہ سنج تھے لہٰذا ظرافت، شوخی، مزاح، طنز اور طعن جیسی خوبیاں قدرتی طور پر ان کے حصے میں آئی تھیں۔ طنز پردازی اور لطیفہ گوئی میں ان کا رنگ خالص ایرانی تھا۔ اپنے ایک دوست کی بیوی کے انتقال پر ایک تعزیتی خط میں یہ شعر تحریر فرماتے ہیں۔

زنِ نو کُن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ نآید بہ کار

غالب کی فارسی غزل گوئی سے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہوئے A Bausani اپنے ایک مضمون "Ghalib's Persian Poetry" میں لکھتے ہیں۔

"Speaking of Ghalib's Persian Ghazals, one is

naturally led to a comparison with his urdu ghazals, one is naturally led to a comparison with his urdu ghazals. but i shall only say here that ghalib's persian ghazals are more 'regular' according to the rules of the classical ghazals, whereas his urdu poems, as he himself declared, are purely an intikhab, a selection, more similar to qita's than to the classical ghazal" .[٦]

غالب کا دور غم والم کا دور تھا۔ مغلوں کی شکست وریخت کے نتیجے میں ملک سیاسی افراتفری کا شکار ہو چکا تھا۔ انگریز اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بگڑتے جارہے تھے۔ انگریز ان حالات کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو غلامی کے بھنور میں دھکیلنا چاہتے تھے۔ خود غالب قرض کے بوجھ تلے دب گئے تھے۔ ان کے معاشی حالات ناگفتہ بہہ تھے۔

سات بچوں کی یکے بعد دیگرے موت نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ پھر عارف کی ناگہانی موت نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے دلی میں اینٹ سے اینٹ بجا رکھی تھی۔ ان کے کئی عزیز واقارب قتل کردئے گئے تھے۔ حالات نے ان کو کسمپرسی کے عالم میں تن تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا اظہار غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے۔

"..... پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں کتنے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان میں سے کوئی میرا اُمیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر پھر دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا''

غالب نے مذکورہ حالات کا ذکر بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے بعض اشعار میں ضرور کیا ہے۔ لیکن انہوں نے غم روزگار کا ذکر کرتے وقت نا اُمیدی یا بے کسی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلکہ داستان غم بیان کرتے وقت شوخی اور ظرافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یارانند
کہ در ستم روش آموز گارانند

☆☆☆

بجنگ تاچہ بود خوی دلبران کایں قوم
در آشتی نمک زخم دلفگارانند

☆☆☆

برند دل به ادای که کس گمان نبرد
فغان زپرده نشیناں که پرده دارانند

☆☆☆

ز زرع و کشت شنا سند نی حدیقه و باغ
زبهر باده هوا خواهِ باد و بارانند

☆☆☆

ز وعده گشته پشیمان و بهرِ دفع ملال
امید وار برگ اید وارانند

☆☆☆

هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسسته لنگر کشتی و ناخدا خفته است

☆☆☆

خود از درد بی تاب و خود چاره جو
خود آشفته مغز و خود افسانه گو

☆☆☆

تو نالی از خلهٔ خار و ننگری که سپهر
سر حسین علی بر سنان بگرداند

☆☆☆

دل را ز غمِ گریهٔ بی رنگ بجوش آر
اجزای جگر حل کن و درچشم ترم ریز

☆☆☆

اگر بہ طالعِ من سوخت خرمنم چہ عجب
عجب ز قسمت یک شہرِ خوشہ چین دارم

☆☆☆

نشستہ ام بگدائی بشاہراہ و ہنوز
ہزار دزد ہر گوشہ در کمین دارم

☆☆☆

زخم ناخوردہ ما روزی اغیار مکن
کان بآرایش دامان نظر داشتہ ایم

☆☆☆

A Bausani اپنے مضمون "Ghalib's Persian Poetry"
میں مغنی نامہ کی روشنی میں غالب کے تصورِ غم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"In the path followed by my thought, the guiding Khizr of my poetical Journey has been sorrow. I am not a Nizami, who learnt the rules of the legitimate enchantment of poetry from the phanthom of Khizer, nor a Zulabi, who was led by Nizami in a dream to bedew with the crystalline revulet of Art the garden of wisdom..... I have been influenced only by sorrow; sorrow made me a mourner weaping and singing at the death bed of Joy" [۷]

جہاں تک غالب کی قصیدہ نگاری کا تعلق ہے اس فن میں بھی انہوں نے ایک انفرادی انداز اپنایا ہے۔ فارسی کے جن نامور قصیدہ گو شعرا کا ان کے

قصائد پر اثر ہے وہ ہیں خاقانی، سلمان، ظہیر فاریابی، عرفی اور نظیری۔ خواجہ الطاف حسین حالی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''قصاید میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمانؔ وظہیرؔ کا اور کہیں عرفیؔ اور نظیریؔ کا اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبتِ مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب اپنے قصائد پر نازاں تھے۔ غالب اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں..... ''وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر''۔[۸]

عہدِ غالب میں ہندوستان سیاسی افراتفری کا شکار ہوگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان کے خاندان کے کئی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ وہ خود معاشی بدحالی کا شکار ہو چکے تھے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لیے ان کو بادلِ ناخواستہ امرا اور وزرا کی مدح میں قصیدے لکھنے پڑے۔ وہ ایک ممدوح کی مدح میں لکھے گئے قصیدے چند شعروں کا ہیر پھیر کر کے اُسے کسی دوسرے ممدوح سے منسوب کرتے تھے۔ بعض ممدوحین کی مدح میں قصیدے لکھتے وقت غالب کو شدید ذہنی عذاب سے گذرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ان ہی لوگوں نے مغلوں کو دھوکہ دے کر ان کی ساخت کو کمزور کر کے ان کی حکومت کا خاتمہ کر ڈالا اور ان ہی کی وجہ سے ان کے عزیز و اقارب پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ

پڑے۔

غالب کی قصیدہ نگاری کی اہم خصوصیت ان کی مضمون آفرینی، ندرت خیال اور جدت طرز ادا ہے۔ جدت پسندی ان کے مزاج کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی ان کے قصیدوں کی ایک اور صفت ہے لیکن اسی صفت کی وجہ سے قارئین نے ان کے قصائد میں پیچیدگی محسوس کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایران میں ان کی وہ پذیرائی نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ غالب نے اپنے بعض قصیدوں میں فلسفہ اور علم نجوم سے کئی مضامین تراشے ہیں۔ ان کے چھوٹے بحر والے قصیدوں میں ایک خاص قسم کی روانی پائی جاتی ہے۔

کلیات غالب میں قصائد کی کل تعداد 64 ہے۔ پہلا قصیدہ مذہبی نوعیت کا ہے جس میں غالب نے اللہ تعالیٰ کے واحد اور لاشریک ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ یہ قصیدہ بعنوان ''توحید'' غالب کی مذہبی عقیدت پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی
مردہ را از خویش دریا برکراں انداختہ

دوسرا اور تیسرا قصیدہ نعت کے لیے مخصوص ہیں۔ ان دونوں قصیدوں میں غالب نے پیغمبر اسلام حضرت نبی اکرمؐ کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں اور آٹھواں قصیدہ نعت اور منقبت پر مشتمل ہیں۔ چونکہ غالب کا تعلق شیعہ فرقہ کے ساتھ تھا اور وہ حضرت علیؓ کے ساتھ گہری محبت رکھتے تھے۔ مذکورہ قصائد میں انہوں اسی گہری محبت اور عقیدت کا اظہار بڑی گرمجوشی کے ساتھ کیا ہے۔ نویں قصیدے میں غالب نے شہیدِ اکبر

حضرت امام حسینؑ کی شہادت بیان کی ہے۔ان کی شجاعت کے ساتھ ساتھ اسلام کی فتح یابی اورسربلندی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ دسویں قصیدے میں دوسرے شیعہ امام کا ذکر کیا گیا ہے۔ گیارواں قصیدہ حضرت علیؓ کے فرزند شہید حضرت عباس کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ بارہویں قصیدے میں حضرت امام مہدیؑ کی مدح سرائی کی گئی ہے جن کے بارے میں اہل شیعہ کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے ختم ہونے پر وہ ظہور پذیر ہوں گے۔ سولواں قصیدہ محمد اکبر شاہ کی مدح میں ہے جبکہ پندرہ قصیدے آخر مغل تاجدار بہادر شاہِ ظفر کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ غالب کو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ وہ ذوق کے انتقال کے بعدان کے استاد مقرر ہوئے۔ بہادر شاہِ ظفر غالب کا مالی امداد کیا کرتے تھے۔ تین قصیدوں میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ چودہ قصیدوں میں ان برطانوی شخصیات کی تعریف کی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں تعینات کی جاتی تھیں۔ انیس قصیدے مغل دربار کے ساتھ وابستہ اہم شخصیات کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان ممدوحین میں نوابِ اودھ واجد علی شاہ کے علاوہ دو غیر مسلم شیو دھیان سنگھ بہادر اور راجا نریندر سنگھ بھی شامل ہیں۔ آخری قصیدہ غالب نے اپنی ذات کے لیے مخصوص رکھا ہے۔ غالب کے قصاید میں جو جُز بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ تشبیب ہے۔ وہ تشبیب میں بڑی کامیابی کے ساتھ رنگ تغزل میں قائم رکھتے ہیں:

> "I think that Ghalib is great above all as a lyric poet, which is in a way conformed by Hali himself when he speaks of the special excellence of Ghalibs in Precisely the most lyrical part of qasida, namely the tashbib" [9]

قصیدہ ''درمدح بہادر شاہ ظفر'' کی تشبیب میں یہ اشعار غالب کی عمدہ تشبیب نگاری پر دلالت کرتے ہیں۔

گفتم حدیث دوست بہ قران برابر است
نازم بکفر خود کہ بہ ایمان برابر است

☆☆☆

کین ہای آشکار کہ سرجوش ناز اوست
در ذوق با نوازش پنہاں برابر است

غالب کے کلیات میں مثنویوں کی تعداد گیارہ ہیں۔ پہلی مثنوی کا عنوان ''سرمۂ بینش'' ہے۔اس مثنوی میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی تعریف کی گئی ہے۔مولانا روم کی مثنوی معنوی کی بحر رمل میں لکھی گئی ہے اور اُسی مثنوی کے پہلے شعر سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔

بشنو از نی چوں حکایت می کُند
از جدائی ہا شکایت می کُند

مثنوی کا اختتام ایک دُعایہ شعر سے ہوتا ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کی طویل عمر کے لیے دعا کی گئی ہے۔

بر دُعائے شاہ سخن کوتاہ باد
تا خدا باشد بہادر شاہ باد

غالب کی دوسری مثنوی کا عنوان ''دردوداغ'' ہے۔اس میں انہوں نے انسانی تقدیر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ان کے مطابق انسان کی تقدیر معین اور مقرر ہے۔اس میں کسی طرح کا تغیر وتبدل کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ غالب نے فلسفہ تقدیر کو وضاحتاً بیان کرنے کے لیے تمثیلی انداز اپنایا ہے اور

ایک دلچسپ قصہ پیش کیا ہے۔ایک کسان اپنے والدین کے ساتھ زندگی بسر کررہا تھا۔غربت اورافلاس کے نتیجے میں ان کی زندگی عذاب بن کررہ گئی تھی۔ان حالات کے نتیجے میں گھر کے تینوں افراد نے کہیں دور جانے کا فیصلہ کیا تاکہ روزی روٹی کا انتظام کرسکیں۔دوران سفران کا گذر ریگستان سے ہوا جہاں سخت گرمی کے نتیجے میں ان کو شدید پیاس لگ گئی۔پانی کی تلاش میں وہ تینوں افرادِ خانہ ایک جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے جہاں ایک درویش قیام پذیر تھا۔درویش نے ان کی شدید پیاس محسوس کرکے ان کو پانی پلایا۔پیاس بجھنے کے بعد انہوں نے درویش کو اپنی تنگدستی کی کہانی سنائی اوراللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کی درخواست کی۔درویش ان کی کہانی سُن کر بہت متاثر ہوا اوراللہ تعالیٰ سے ان کی ایک ایک مراد پورا کرنے کے لیے دُعا کی۔درویش کی دُعا سے تینوں لوگ بہت خوش ہوئے۔سب سے پہلے کسان کی بوڑھی ماں نے جوان ہونے کی دعا مانگی۔اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا قبول کی اوروہ ایک دم جوان ہوگئی۔اب وہ سرعت کے ساتھ بطرف گھر روانہ ہوئے تاکہ فرصت کے ساتھ اپنی اپنی مراد پورا کرنے کے لیے دعا کریں۔واپسی پران کی ملاقات ایک شہزادے کے ساتھ ہوئی جو گھوڑے پر سوار تھا۔جوں ہی شہزادے کی نگاہیں جوان اورشوخ لڑکی (پہلی بوڑھی ماں) پر پڑی تواس کا جی للچایا۔وہ اس پر فریفتہ ہوا۔شوخ لڑکی نے بھی اثبات میں جواب دیا۔نتیجتاً شہزادے نے اپنی معشوقہ کوگھوڑے پر بٹھا کراپنے ساتھ لیا۔بیوی کی یہ بے وفائی دیکھ کرشوہر غضبناک ہوااوراللہ تعالیٰ سے اس کے سُور بننے کی دعا کی۔شوہر کی دُعا قبول ہوئی اور بیوی ایکدم سور بن گئی۔شہزادے نے جب مڑکر دیکھا کہ ایک سوراس کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے تواس نے فوراً اُسے گھوڑے سے گرادیااورروانہ ہوا۔ٹھکرا

جانے کے بعد وہ مادہ سُور دوبارہ اپنے شوہر اور بیٹے کے پیچھے پیچھے چلدی۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر کسان سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنی ایک دُعا استعمال کر کے ماں کی پہلی حالت برقرار رکھ دی۔ وہ فوراً سُور سے بوڑھی ماں بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کی دُعائیں رائیگان ہو گئیں اور ان کی تقدیر ویسی کی ویسی رہ گئی۔

تا نبود یاری بخت بلند
چارۂ عیسیٰ نفتُد سود مند
حاصل شاں زاں تگ و تاز ہوس
رفتی و آمدنی بود و بس
عالم تقدیر چنین است و بس
حاصل تحریر من اینست و بس

''چراغِ دیر'' غالب کی تیسری مثنوی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار میں غالب نے اپنی غریب الوطنی کا اظہار کیا ہے۔ بنارس میں رہ کر ان کو دہلی کی بہت یاد آتی ہے۔ ان کو دہلی میں رہنے والے قریبی دوستوں یعنی شاعر فضل حق خیرآبادی، حسام الدین حیدر اور امین احمد خان کی یاد بہت ستاتی ہے۔ دوسری طرف وہ اس مثنوی میں بنارس کی خوبصورتی اور دلکشی کو بیان کرتے ہیں۔ شہر کی یہی خوبصورتی غالب کے دل سے جدائی کا بوجھ ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بنارس کا شہر غالب کے لیے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ ان کے لیے کعبۂ ہند ہے۔

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آر
درس جنت ازاں ویرانہ یاد آر

غالبؔ نے مثنوی ''رنگ وبُو'' کلکتہ سے واپس آنے کے بعد رشتۂ تحریر میں لائی ہے۔ طویل سفر کے اثرات اور دہلی سے دور رہنے کی کیفیت اس مثنوی میں نمایاں طور پر پیش کی گئی ہے۔ اس مثنوی کا بنیادی مقصد دنیا کی بے ثباتی ہے۔ چنانچہ دنیا کا انجام فنا ہے لہٰذا اس کے حصول کے لیے انسان کو اپنا سکون وقرار نہیں گنوانا چاہے۔ اس فانی چیز کو حاصل کرنے کی تمام تر کوششیں فضول اور بے فائدہ ہیں۔

اے ہمہ تن وسوسہ سود تو کو
دہر سراب است وجود تو کو

غالب نے اپنے اس خیال کو اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے تمثیلی انداز اپنایا ہے۔ غالب نے ایک علامتی کہانی پیش کر کے مثنوی کو نہایت ہی دلچسپ بنایا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک بادشاہ ہے جو اپنی سخاوت کے لحاظ سے عوام میں بہت مقبول تھا۔ وہ عوام کی سہولیت اور بھلائی میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ ایک دن گدڑی پہنا ایک فقیر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں اپنا لباس اور کاسہ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ سودا کرنے پر راضی ہوا اور مذکورہ دونوں چیزیں شاہی خزانے میں رکھ دیں اور اس کے عوض فقیر کو اچھی رقم عطا کی گئی۔ فقیر یہ رقم لے کر روانہ ہو گیا۔ ایک رات بادشاہ نے خواب میں ایک خوبصورت پری کو دیکھا جس نے خود کو بادشاہ کی دولت کہا۔ وہ فقیری کے لباس کی بدبُو سے تنگ آ کر بھاگنا چاہتی تھی۔ بادشاہ نے کوئی پرواہ کیے بغیر پری کو جانے کی اجازت دے دی اور وہ محل خانے سے چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے ایک اور شکل دیکھی جس کا چہرہ خوفناک تھا۔ اس نے خود کو بادشاہ کی قوت بتلایا۔ اس نے بھی فقیر کے کثیف لبادہ کی بدبُو سے مزاج بگڑنے کی

شکایت کی اور وہاں سے بھاگ نکلنے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے پہلے کی طرح کوئی پرواہ کئے بغیر اس کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دی۔ پھر ایک تیسری شکل بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئی جس نے خود کو بادشاہ کی بہادری اور ہمت بتلایا۔ اس نے بھی مذکورہ دو شکلوں کی طرح جانے کی اجازت مانگی لیکن بادشاہ نے اب کی بار رخصت دینے سے انکار کیا۔ اس نے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ شجاعت کو رُکنے کی درخواست کی کیونکہ اسی کی پشتپناہی کی وجہ سے اس نے دولت اور قوت کو جانے کی اجازت دی تھی۔ شجاعت کے جانے پر بادشاہ کا وجود ہی خطرے میں پڑتا۔ شجاعت بادشاہ کی منت وسماجت سے متاثر ہوئی اور ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہنے کا اقرار کیا۔ بقولِ غالب دولت یا طاقت سے محروم ہونے پر انسان کو غمزدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس کے لیے انسان کے اندر شجاعت کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ غالب نے اپنی زندگی میں بھی سوائے غم واندوہ کچھ بھی نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ دولت اور طاقت سے محروم رہے لیکن فقط اپنی شجاعت سے مسائل اور مشکلات پر غالب آ گئے۔

ہمت اگر بال کشائی کند
صعوہ تواند کہ ہمائی کند

☆☆☆

ہمت ما نیز شہودِ حق است
ہر چہ بسنجیم وجود حق است

☆☆☆

ہمت ما غیرت حق ست و بس
کثرت ما وحدت حق ست و بس

☆☆☆

مثنوی ''بادِ مخالف'' غالب نے کلکتہ میں قیام کے دوران رشتہ تحریر میں لائی جب وہ اپنی پنشن واگذار کرنے کے سلسلے میں دوسال تک وہاں رہے۔ اپنے اس دوسالہ قیام کے دوران غالب کو کلکتہ کے شاعروں، ادیبوں اور مفکروں کے ساتھ راہ ورسم قائم کرنے کا موقعہ ملا۔ اس دوران ان کو مدرسہ عالیہ کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی جوان ہی کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ مشاعرے کے دوران غالب کے دو اشعار پر اعتراض کیا گیا اور اعتراض کرنے والوں نے کلکتہ کے ایک مشہور شاعر قتیل کو بطورِ سند پیش کیا۔ اسی اعتراض کو بنیاد بنا کر حامیانِ قتیل اور غالب کے درمیان سخت بحث چھڑ گئی اور مخالفین غالب آگ بگولہ ہو گئے۔ ان کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے غالب نے اپنے ہمدردوں کی فرمائش پر مثنوی ''بادِ مخالف'' لکھ ڈالی۔ اس مثنوی نے یقیناً مخالفت کی تمازت میں بڑی حد تک کمی کردی۔ غالب نے ہندوستانی فارسی شعرا کو بطورِ سند قبول کرنے سے صاف انکار کیا البتہ ایرانی فارسی شعراء کی مدح وستائش لکھ ڈالی۔

گرچہ بیدل ز اہل ایران است
لیک ہمچوں قتیل ناداں است

☆☆☆

کاین زبان خاص ایران است
مشکل ما و سہل ایران است

A-Bansani مثنوی ''بادمخالف'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

"It contains interesting meterial for a better understanding of his ideas in Persian Poetry. He calls himself an uninvited guest & protests against the injust criticism of his persian poetry by the representatives of the new Indian Style" [10]

مثنوی ''بیان نموداری شان نبوت وولایت کہ درحقیقت پرتوِ نورالانوار حضرت الوہیت ست'' غالب کے مذہبی عقائد پر مبنی ایک طویل مثنوی ہے۔ بقول حالی غالب نے یہ مثنوی اپنے ایک قریبی دوست مولانا فضل حق کی فرمائش پر لکھی جو وہابیوں کے سخت خلاف تھے۔ یہ مثنوی لکھوانے کا مولانا کا بنیادی مقصد وہابیوں کے جھوٹے عقیدوں کی تردید کروانا تھا۔ چونکہ وہابی بزرگان دین کے ساتھ عقیدت نہیں رکھتے تھے اوران کے مزاروں کی زیارت کی مذمت کرتے تھے۔ ان کی اس تنگ نظری کے برعکس غالب نے مذکورہ مثنوی میں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین سے عقیدت رکھنے اوران کے مزاروں پر دعا مانگنے کو جائز قرار دیا اور وہ فقط حضرت نبی اکرم ﷺ کو ہی خاتم النبیین تسلیم کرتے ہیں۔

منشاء ایجاد ہر عالم یکی است
گر دو صد عالم بود خاتم یکی است

''تہنیت عید شوال'' غالب نے جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے عیدالفطر کے موقع پر رشتۂ تحریر میں لائی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے ممدوح اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ان کے ابا واجداد کی تعریف کی ہے۔ غالب نے

اپنے تئیں بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی اور ہمدردری کا بھی ذکر کیا ہے۔انہوں نے شکر گذاری کے بعد مثنوی کے آخر پر ممدوح کے حق میں دُعا کی ہے۔

دولت شاہ دولت جاوید باد
تا ابدش عید پس از عید باد

مثنوی ''درتہنیتِ عید بہ ولی عہد'' مرزا فتح الملک کی شان میں لکھی گئی۔ نویں مثنوی بادشاہِ اودھ کی کتاب ''بست و ہفت اختر'' کے پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی ہے۔ یہ پیش لفظ کل ۳۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ دسویں مثنوی کل ۳۸۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ غالب نے یہ مثنوی اصل میں بانی علیگڈھ مرحوم سرسید احمد خان کی تصنیف ''آئین اکبری'' کی تقریظ کے ذیل میں قلمبندی کی تھی لیکن صاحب کتاب نے اس تقریظ کو جزو کتاب نہیں ہونے دیا۔ غالب نے اس مثنوی میں سرسید احمد خان کو مغربی دنیا کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی طرف متوجہ کرنے کی سعی کی ہے۔

غالب کی سب سے ضخیم اور عمدہ مثنوی ''ابرِ گہربار'' ہے۔اس میں ۱۰۹۸ اشعار موجود ہیں۔ یہ طویل مثنوی چھ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ ۱۔حمد، ۲۔مناجات، ۳۔نعت، ۴۔منقبت، ۵۔مغنی نامہ، ۶۔ساقی نامہ۔ چنانچہ غالب اصل میں پیغمبر اسلام نبی اکرم ﷺ کی لڑی ہوئی جنگوں پر مبنی ایک طویل مثنوی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مذکورہ اشعار اُسی مثنوی کا حصہ ہیں لیکن نامساعد حالات کے نتیجے میں ان کا ارادہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ مثنوی کا آغاز حمد سے کیا گیا ہے۔ غالب نے اس میں خدائے عزوجل کی عظمت اور شان وشوکت بیان کرتے ہوئے اس کی رحمت سے پُرامید ہونے کا بھی اقرار کیا ہے۔ غالب پوری کائنات کو عظمتِ خداوندی کا مظہر مانتے ہوئے اپنے

گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں جن کا ارتکاب انہوں نے مصیبتوں سے تنگ آ کر کیا ہے۔ غالب نے درگاہِ خداوندی سے التجا کرنے کے لیے ایک بادشاہ کا قصہ بطور تمثیل پیش کیا ہے۔ ایک بادشاہ جنگ لڑنے کے لیے روانہ ہوا اور جنگ میں فتح یاب ہو کر فخر کے ساتھ واپس اپنے شہر پہنچا۔ جہاں لوگوں نے نہ صرف اُس کو تحفے پیش کیے بلکہ اُس کے گھوڑوں پر گُلباری بھی کی۔ فتح یابی کے اس دلکش جشن پر وہ لوگ بھی حاضر تھے جو مفلوک الحال اور مصیبت زدہ تھے جنہوں نے بطور تحفہ کچھ بھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ موقعہ پر حاضر ایک وزیر نے ان لوگوں کو منحوس کہہ کر وہاں سے جانے کے لیے کہا لیکن فاتح بادشاہ نے وزیر کو یہ کہہ کر منع کیا کہ یہ میرے لوگ ہیں۔ غالب اسی کہانی کے تناظر میں خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہیں کہ یا اللہ محشر کے دن اُسی بادشاہ کی طرح آپ بھی مجھ پر نظرِ کرم کر۔ میرا جرم سوائے شراب خوری کے کچھ بھی نہیں ہے اور یہ جرم میں نے مصیبتوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے غم کو غلط کرنے کے لیے کیا جو مصیبتیں مجھے آپ کی طرف سے ہی عنایت ہوئیں۔

غالبؔ اپنے غم بیکراں کا ذکر کرتے ہوئے وثوق سے کہتے ہیں کہ ان کے بے قرار دل کو اللہ کے بنائے ہوئے جنت میں بھی سکون نہیں ملے گا۔ بقول غالب میں بے شک شراب طہورا سے محفوظ ہو جاؤں گا لیکن جنت میں ستارۂ شام دیکھنے کو تو نہیں ملے گا کیونکہ وہاں شب و روز کا تصور ہی نہیں ہے۔ وہاں مست و مدہوش دوستوں کا گروہ نہیں ملے گا اور مخمور کرنے والی بارشیں بھی نہیں ہوں گی۔ جہاں پت جڑ کا موسم نہیں ہوگا وہاں موسم بہار کہاں ہوگا؟ وہاں ہجر کے بعد حسیناؤں کے ساتھ وصل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ انتظار کیے بغیر محبت کرنے میں کیا لطف ہوگا؟ محبت میں جھوٹی قسمیں کھا کر مصروف بہ

انتظار رکھنے والی حسینائیں نہیں ہوں گی۔ جنت کا حُسن و جمال ہمیشہ تابع رہے گا لیکن کسی کے ہونٹوں سے تلخ سننے کا موقع نہیں ملے گا جبکہ میں تلخ سننے کا عادی ہوں۔

مثنوی کی نعت میں معراج کا بیان ہے۔ منقبت میں حضرت علی کی تعریف ہے۔ مغنی نامہ میں عقل کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساقی نامہ میں دنیا کا صوفیانہ تصور پیش کیا گیا ہے۔

''مثنوی ابر گہربار کا مجموعی تاثر ایک شکایت نامے کا سا ہے اگر چہ یہ مثنوی حمد اور منقبت وغیرہ کی بھی حامل ہے۔ اس کی جان مناجات کا وہ حصہ ہے جس میں غالب نے اللہ سے گلہ کیا ہے اور ایک رند ہزار شیوہ کی سی بیبا کی مگر خلوص نیت کے ساتھ اپنے انفرادی انداز میں دل کی تمنا کو ایک شدید احساس اندوہ کے ساتھ بیان کیا ہے..... یہ مثنوی ہندوستان کے فارسی ادب میں غم روزگار کے اظہار بیان میں نہ صرف کم نظیر ہے بلکہ شاہکار بھی.....

مثنوی ابر گہربار میں ظاہری خوبصورتی بھی ہے اور باطنی حُسن بھی، اس میں شوق وجلال ہے اور لطافت و جمال بھی۔ یہ مثنوی آرزوؤں کے فریب خوردہ ایک سادہ دل آدمی کے رُوح کی پکار ہے۔ یہ افضل مخلوقات کی اس دنیا میں پامال وزبون حال بن جانے کی المیہ داستان ہے اور خالق ومخلوق کے باہمی رشتے سے پیدا ہوئے ایک مغلوب بندے کی پکار ہے..... یہ مثنوی آشوب آگہی کا تلاطم بھی ہے اور تلاطُم کے بعد کا سکون

بھی ہے۔اس لحاظ سے میرے خیال میں اگر مرزا غالب سے
اُس کے فارسی آثار میں یہی ایک مثنوی باقی رہ جاتی جب بھی
ہم ان کی فارسی دانی، فنکاری اوران کے آشوب آگہی سے
قائل ہوجاتے''۔[11]

غالب کے فارسی کلیات میں ۱۳۰/رباعیات موجود ہیں۔ بقول حالی غالب کی رباعیات میں اکثر شوخی و بے باکی، بادہ خواری، فخرومباہات اور شکایت کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ان رباعیات سے غالب کی زندگی اور گھر کے احوال ترتیب دئے جاسکتے ہیں کیونکہ انہوں نے عزیز واقارب اور ہم عصر شعراء کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

نے کشتۂ زخم ناوک و شمشیرم
نے خستۂ ناخن پلنگ و شیرم
لب می گزم و خون بزبان می لیسم
خون می خورم و ز زندگانی سیرم

غالب نے فارسی میں ۱۳۱ قطعات بھی لکھے ہیں۔ان قطعات میں بھی انہوں نے اپنے حسب ونسب اور مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کہیں غم دوران کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالب نے بعض قطعات میں اُردواور فارسی کے عظیم شاعروں اورادیبوں کی تاریخ وفات نکالی ہیں۔

ایک بارخواجہ الطاف حسین حالی نے مرزا غالب کو پابندصوم وصلوٰۃ ہونے کی تاکید کی تھی۔ غالب نے اسی تناظر میں ایک قطعہ میں طنزاً کہا تھا کہ اگر مجھے دوبارہ جنم مل جائے تو فقط دوکام کروں گا۔ایک یہ کہ دن رات اللہ تعالیٰ کی

عبادت کروں گا دوم یہ کہ خواجہ الطاب حسین حالی سے معافی مانگوں گا ۔

تو کہ ای شیفتہ و حسرت لقب داری
ہمی بلطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بی سبب رنجید
تو گر شفیع نگردی، بگو، چہ کار کنم
دوبارہ عمر دھندم اگر بغرض محال
بران سرم کہ دران عمر این دو کار کنم
یکی ادای عبادات عمر پیشنہ
دگر بہ پیش گاہ حالی اعتذاز کنم

❁❁❁

حواشی

۱ : کلیات غالب فارسی ۔ جلداول ۔ داکٹر سید تقی عابدی ۔ ص:۳۱

۲ : دیوان غالب دہلوی ۔ ڈاکٹر محمد حسین حائری ۔ ص:۱۸

۳ : دیوانِ غالب دہلوی از دکتر محمد حسن حائری ۔ ص:۳۲

۴ : کلیاتِ غالب مرتب امیر حسن نورانی ۔ ص (د)

۵ : مرزا غالب کی فارسی شاعری... مرحوم ڈاکٹر شمس الدین احمد رسالہ ''دانش'' شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی ۔ ص:۱۰۷

۶ : Ghalib life, Letters and Ghazals edited by RALPH RUSELL ... Page : 401

۷ : Ghalib life, Letters & Ghazals edited by Ralph Russel.

۸ : یادگار غالب ۔ الطاف حسین حالی ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۔ ص:۲۹۷

۹ : Ghalib Life , Letters & Ghazals edited by Ralph Russell, Page: 401

۱۰ : Ghalib Life , Letters & Ghazals edited by Ralph Russell, Page: 394

۱۱ : مرزا غالب کی فارسی شاعری ۔۔ ایک جائزہ ڈاکٹر شمس الدین ۔ رسالہ دانش کشمیر یونیورسٹی ۔ ۱۹۷۸ء

نمونۂ کلام

غزل

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است
آری کلام حق بزبان محمدؐ است

آئینہ دار پر تو مہراست ماہتاب
شان حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
امّا کشاد آن ز کمان محمدؐ است

دانی اگر بمعنی لولاک وارسی
خود ہر چہ از حقست از آن محمدؐ است

واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگزار
کا ینجا سخن ز سروِ روان محمدؐ است

بنگر دونیمہ گشتنِ ماہ تمام را
کانِ نیمہ جنبشی ز بنان محمدؐ است

غالبؔ ثنای خواجہ بیزدان گزاشتم
کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

غزل

سحر دمیده و گل در دمید نست مخسپ
جهان جهان گلِ نظاره چیدنست مخسپ
مشام را بشمیمِ گلی نوازش کن
نسیمِ غالیه سا در وزیدنست مخسپ
ستارهٔ سحری مژده سنجِ دیداریست
ببین که چشم فلک در پریدنست مخسپ
نشاط گوش بر آواز قلقل است بیا
پیاله چشم براهِ کشیدنست مخسپ
نشان زندگیِ دل دویدنست مایست
جلای آئینهٔ چشم دیدنست مخسپ
زدیده سود حریفان کشودنست مبند
ز دل مراد عزیزان تپیدنست مخسپ
بذکر مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست
گرت فسانهٔ غالب شنیدنست مخسپ

نظم

پاسبانان بہم آئید کہ من می آیم
درِ زندان بکشائید کہ من می آیم

ہر کہ دیدی بدرِ خویش سپاسم گفتی
خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم

جادہ نشناسم و ز انبوہِ شامی ترسم
راہم از دور نمائید کہ من می آیم

رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکند
سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم

خست تن در رہ و تعذیب ضرور است اینجا
نمک آرید و بسائید کہ من می آیم

عارض خاک بپاشیدن خون تازه کنید
رونق خانه فزائید که من می آیم

چون من آیم بشما شکوهٔ گردون نه رواست
زین سپس ژاژ مخائید که من می آیم

هان عزیزان که درین کُلبه اقامت دارید
بخت خود را بستائید که من می آیم

تا بدروازهٔ زندان پی آوردن من
قدمی رنجه نمائید که من می آیم

چون سخن سنجی و فرزانگی آئین منست
بهره از من بربائید که من می آیم

بخود از شوق ببالید که خود باز روید
بمن از مهر گرائید که من می آیم

بسکه خویشان شده بیگانه ز بدنامیِ من
غیر نشگفت خورد گر غم ناکامیِ من

❁❁❁

مرثیه

ای رہ نوردِ عالم بالا چگو نہ ای
ما بی تو در ہمیم تو بی ما چگو نہ ای

از سایہ در غم تو سیہ پوش شد ہما
ای خفتہ در نشیمنِ عنقا چگو نہ ای

زان پس کہ باتو آب و ہوای جہان نساخت
در روضۂ جنان بہ تماشا چگو نہ ای

با گلرخان دہر وفای نہ داشتی
با حوریانِ آئینہ سیما چگو نہ ای

ما بیخودان بحلقۂ ماتم نشستہ ایم
از خویشتن بگوی کہ تنہا چگو نہ ای

بی مطرب و ندیم و غلامان خرد سال
بی باغ و قلعه و لب دریا چگو نه ای

بعد از تو شاه خیل ترا برقرار داشت
اینجا عزیز بوده ای آنجا چگونه ای

ای بعد مرگ راتبه خوار تو عالمی
پروانهٔ چراغ مزار تو عالمی

مثنوی

بروزی که مردم شوند انجمن
شود تازه پیوند جانها به تن

روان را به نیکی نوازندگان
بسرمایۂ خویش نازندگان

گهر های شهسوار پیش آورند
فروهیده کردار پیش آورند

بهنگامه با این جگر گوشگان
در آیند مشتی جگر توشگان

ز حسرت بدل بُرده دندان فرو
ز خجلت سر اندر گریبان فرو

در آن حلقه من باشم و سینه ای
ز غمهای ایّام گنجینه ای

در آب و در آتش بسر بُرده ای
زدشواریِ زیستن مرده ای

تن از سایۀ خود به بیم اندرون
دل از غم به پهلو دونیم اندرون

ز ناسازی و ناتوانی بهم
دم اندر کشاکش ز پیوندِ غم

ز بس تیرگی های روزِ سیاه
نگه خورده آسیب دوش از نگاه

به بخشای برناکسی های من
تهی دست و درمانده ام وای من

بدوش ترازو منه بارِ من
نه سنجیده بگزار کردارِ من

اگر دیگران را بود گفت و کرد
مرا مایۀ عمر رنج است و درد

❁❁❁

قصیده در مدح بهادرِ شاه ظفر

گفتم حدیث دوست به قرآن برابر است
نازم بکفر خود که به ایمان برابر است

کین های آشکار که سرجوش ناز اوست
در ذوق با نوازش پنهان برابر است

نی وعده ای نه پُرسش رازی نه شکوه ای
داغم ز نامه ای که بعنوان برابراست

نی کف گرفت ساعد ونی لب ربوده بوس
در ناخوشی وصال به هجران برابر است

پیوسته پرفشان و نه جسته ز آشیان
پرواز من به جنبش مژگان برابر است

تن زن بشکر و شکوه که در مسلک رضا
راحت برنج و سود به نقصان برابر است

در دیدۂ جریدہ روانِ یگانہ بین
کثرت بخواب ہای پریشان برابر است

ذات حقست واحد و ہستی ست عین ذات
بزم جہان بہ مجمع اعیان برابراست

غالب بہل تصوف و ہنگامہ گرم کن
نال قلم بشمع فروزاں برابراست

بالد بخویش خواجہ چہ گوئی سخنورش
غافل کہ این ترانہ بہ بہتان برابراست

نی ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود
نی ہر سخن سرای بہ سحبان برابراست

نی ہر شتر سوار بصالح بود ہمال
نی ہر شبان بہ موسی عمران برابراست

نی ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوی بُرد
نی ہر کہ باغ ساخت برضوان برابراست

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مؤلف
۱	فارسی ادب بعہداورنگ زیب	پروفیسرنورالحسن انصاری
۲	غالب کی فارسی شاعری	پروفیسرارشادکرمانی
۳	یادگارِغالب	خواجہ الطاف حسین حالی
۴	مثنوی ابر گہربار	اسداللہ خان غالب دہلی
۵	عہدوسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک)	پروفیسرتیش چندر
۶	غالب: شاعرزیست	ادارہ۔مولانا آزادنیشنل اُردویونیورسٹی حیدرآباد
۷	غالب کی چندفارسی تصانیف	ڈاکٹرحنیف نقوی
۸	شرح دیوانِ غالب	پروفیسرسلیم چشتی
۹	غالبیات کے چندفراموش گوشے	پروفیسراکبرحیدری کشمیری
۱۰	دیوان غالب دہلوی	دکترمحمدحسین حائری
۱۱	کلیاتِ غالب فارسی	ڈاکٹرسیدتقی عابدی
۱۲	دستنبو	پروفیسرخواجہ احمدفاروقی
۱۳	Ghalib's Life, Letters & Ghazals	Ralph Russel (Oxford)

۱۴	غالب نامہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی
۱۵	بین الاقوامی غالب سیمینار	ڈاکٹر یوسف حسین خان
۱۶	یادو بودِ غالب	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
۱۷	ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
۱۸	کلیات غالب فارسی	امیر حسن نورانی
۱۹	گفتار غالب	مالک رام
۲۰	اصولِ غالب	پروفیسر مختار الدین احمد
۲۱	Urdu- readings in literary Urdu Prose	Gopi Chand Narang
۲۲	غالب شاعر و مکتوب نگار	نور الحسن نقوی
۲۳	اردو کے ادبی معرکے	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر
۲۴	غالب پر چند مقالے	پروفیسر نذیر احمد

رسائل

۱	نقوش غالب نمبر	لاہور ۱۹۷۹ء
۵	علی گڑھ میگزین غالب نمبر	علی گڑھ ۱۹۴۸ء
۳	دانش	شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی

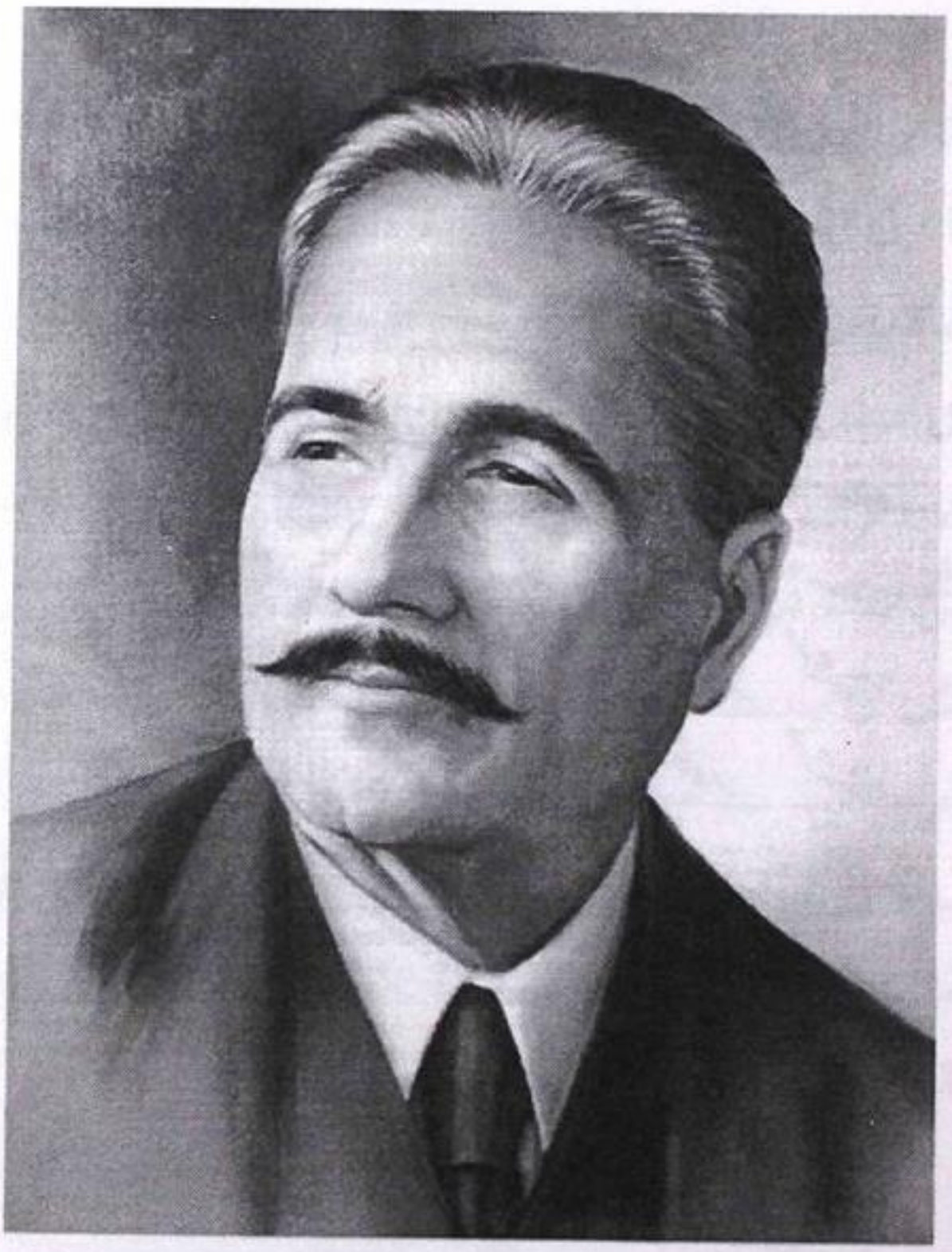

گرچه هندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیرین تر است
فکر من از جلوه اش مسحور گشت
خامهٔ من شاخِ نخلِ طور گشت

علامہ اقبالؒ کی فارسی شاعری

شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو اگرچہ برصغیر ہندو پاک میں لوگ ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن عالمی سطح پر شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا راز ان کی فارسی شاعری میں مضمر ہے۔ اقبال نے حسبِ روایت اپنے ہی گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد مرحوم شیخ نور محمد اقبال اور ان کے دوسرے بھائی عطا محمد کو اپنے ہی گھر میں خود پڑھاتے تھے۔ چنانچہ مرحوم شیخ نور محمد درویشانہ طبیعت کے مالک تھے اور اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر علامہ اقبال کو اپنے ہی والد صاحب سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کا موزون اور مناسب ماحول مل گیا۔ ان کے والد کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کافی ذوق و شوق تھا۔ وہ ان کو عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی دینا چاہتے تھے۔ کلیاتِ اقبال کے دیباچے میں درج ہے:

> ''شیخ نور محمد نے اپنے بچوں کو اُردو، فارسی اور انگریزی تعلیم دلوائی۔ شیخ عطا محمد جو اپنے چھوٹے بھائی سے ۱۴ برس بڑے تھے انجینئر بن گئے اور اقبال مشن اسکول پاکر کالج میں داخل ہو گئے''۔

علامہ اقبال نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو شاعری سے کیا لیکن جب

وہ ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں ولایت چلے گئے تو انہوں نے ایرانی فلسفہ سے متعلق موضوع کو تحقیقی مقالے کے لیے منتخب کیا۔ اس موضوع پر کام کرنے کے دوران اقبال کو فارسی زبان کے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے برگزیدہ شاعروں اور مفکروں کو پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ان حالات کے نتیجے میں اقبال کی ذہنی وسعت میں اضافہ ہوا اور ان کا نظریہ بھی تبدیل ہوا۔ اب وہ اپنی شاعری کو ایک مخصوص دائرے سے نکال کر عالمی سطح پر عروج دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنا پیغام عالم اسلام تک پہنچانا چاہتے تھے جس کے لیے ان کی اُردو شاعری ناکافی تھی لہٰذا انہوں نے اپنے کلام کو عالمگیر بنانے کے لیے فارسی زبان کو ہی بہترین ذریعہ اظہار کی حیثیت سے اپنایا۔ نتیجتاً ولایت سے واپسی پر انہوں نے فارسی زبان میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔

کلیاتِ اقبال کا صاحبِ دیباچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''ولایت سے واپس آ کر انہوں نے اُردو میں بہت سی نظمیں لکھیں لیکن اب فارسی کی طرف ان کی توجہ ہوگئی تھی۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے اُردو میں شعر کہنا چھوڑ دیا تھا لیکن زندگی کے آخری سالوں میں پھر کہیں اُردو کی طرف توجہ کی۔ اُردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو فارسی زبان شاعری کے لیے بہت موزوں تھی اور دوسرے اب اقبال کی شاعری کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ صرف ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے شعر کہتا ہوں اور فارسی کے سوائے کوئی زبان ایسی نہیں جس کے ذریعے اپنے خیالات دوسرے ممالک کے مسلمانوں تک

پہنچائے جا سکتے ہیں''۔

فارسی زبان میں اپنے خیالات، جذبات، احساسات اور تفکرات کو بآسانی پیش کرنے کا اقبال درج ذیل اشعار میں خود اعتراف کرتے ہیں ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتار دری شیرین تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام

سر شیخ عبدالقادر اقبال کے مجموعہ اُردو ''بانگِ دِرا'' کے دیباچے میں اقبال کے فارسی کی طرف راغب ہونے کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فارسی نے وہ کام کیا جو اُردو سے نہیں ہوسکتا تھا۔ تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم و بیش متداول ہے، اقبال کا کلام اس ذریعہ سے پہنچ گیا اور اس میں ایسے خیالات تھے جن کی ایسی وسیع اشاعت ضروری تھی اور اسی وسیلے سے یورپ اور امریکہ والوں کو ہمارے ایسے قابل قدر مصنف کا حال معلوم ہوا''۔

فارسی کی طرف بڑھتی ہوئی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال اپنے ایک دوست غلام قادر گرامی کے نام ایک خط میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُردو شاعری ان کا پیغام عرب و عجم تک پہنچانے میں معذور ہے لہٰذا فقط فارسی زبان ہی اس خلا کو پورا کر سکتی ہے۔

''فارسی کی طرف میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ دل

کا بخار اُردو میں نکال نہیں سکتا''۔

فارسی میں شعر کہنے کے بعد اقبال اس بات پر مطمئن تھے کہ اب ان کی آواز دنیا بھر کے مسلمانوں تک پہنچ گئی۔ عرب اور عجم کے مسلمان میری نوا لے پُرنور سے جاگ اٹھے۔ ان کے خستہ دلوں کو متحرک کرنے میں میری شاعری نے نمایاں رول ادا کیا۔ راہ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں کا ذہن جھنجھوڑنے میں میری شاعری اثر انداز ثابت ہوئی۔ اپنی شاعری کی اثر اندازی پر اقبال اپنے معرکۃ الآراء شعری مجموعہ اسرارِ خودی میں مسرت کا اظہار ان اشعار میں کرتے ہیں ؎

عجم از نغمہ ہای من جوان شد
بودایم متاعِ او گران شد
ہجومی بود رہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کاروان شد
عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدای من درای کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ راہ خوابیدہ و محمل گران است
نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بی خبر است
ز جان بیقرار آتش گشادم
دلی در سینۂ مشرق نہادم
گل او شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہاد او فتادم

شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر مخزن نے کلیات اقبال کے طویل دیباچے میں ان تمام حالات کا جائزہ لیا ہے۔ جو علامہ اقبال کو فارسی شاعری کی طرف راغب کرنے کے لیے ذمہ دار تھے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب حالاتِ تصوف کے متعلق لکھنے کے لیے جو کُتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغیرِ مذاق میں دخل ہوگا۔اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انہوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اُردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اُردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔اس لیے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدائی ہوئی ہے۔وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی۔ پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو

دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اُردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہوگیا۔ یہ اُن کی شاعری کا تیسرا دور ہے جو ۱۹۰۸ء کے بعد سے شروع ہوا اور جواب تک چل رہا ہے۔ اس عرصہ میں اُردو نظمیں بھی بہت ہوئیں اور اچھی اچھی جن کی دھوم مچ گئی۔ مگر اصل کام جس کی طرف وہ متوجہ ہوگئے وہ ان کی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی'' تھی۔ اس کا خیال دیر تک ان کے دماغ میں رہا اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر اترنے لگا اور آخر ایک مستقل کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا جس سے اقبال کا نام ہندوستان سے باہر بھی مشہور ہوگیا''۔

علامہ اقبال کو بحیثیت فارسی شاعری اس وقت بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی جب پروفیسر نکلسن نے ان کی طویل مثنوی ''اسرار خودی'' کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع کیا۔ سید میر حسن نے فارسی زبان وادب سیکھنے کے علاوہ جن فارسی عالموں اور دانشوروں سے اقبال فیض یاب ہوئے ان میں ای جی براؤن اور نکلسن خاص طور پر شامل تھے۔ مولانا غلام قادر گرامی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی ان کے علمی مراسم تھے۔ وہ افغانی مفکر ڈاکٹر صلاح الدین سلجوقی کی عربی دانی سے بہت متاثر تھے اور ایران کے علامہ شیخ عبدالعلی سے بھی مستفید ہوتے تھے۔

اقبال کی فارسی شاعری کے کئی موضوعات ہیں لیکن ان کی من جملہ کوششیں مسلمانوں کی بہبودی اور بہتری کے لیے وقف ہوئی ہیں۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے لیے ہمیشہ مغموم اور غم خوار تھے۔ وہ فقط قرآن مجید کو اقوام و ملل کے لیے آئین اور آئینہ تصور کرتے تھے۔ وہ اس بات کے معتقد تھے کہ مطالعہ قرآن کے بغیر ایک مسلمان کا مسلمانِ کامل ہونا ناممکن ہے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقران زیستن

اقبالؒ پیغمبر اسلام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت رکھتے تھے اور جب بھی آپ ؐ کا ذکر کرتے تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتے تھے کہ یا اللہ قیامت کے دن میرے اعمال کا حساب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے نہ لیں۔ ان ہی جذبات کے تحت اقبال مسلمانوں سے تلقین کرتے ہیں کہ وہ فقط اور فقط نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں تو نہ صرف یہ دنیا بلکہ لوح و قلم بھی ان کے قبضے میں آئیں گے۔

اقبال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم اور نکتہ دان بھی تھے۔ ان کا نظریہ وسیع اور بیکراں تھا۔ انسانی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اعلیٰ فلسفیانہ افکار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ ہمیشہ انسانیت کی تہذیب اور تکمیل کے خواہشمند تھے۔ وہ اپنی شاعری کی وساطت سے انسان کو خودشناسی کا سبق سکھانا چاہتے تھے تاکہ اُسے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس ہو جائے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر شاعری آدم گری کا کام انجام دے سکتی ہے تو یہ وارثِ پیغمبری ہے۔

شعر را مقصود اگر آدم گریست
شاعری ہم وارثِ پیغمبریست

اقبال ناصحِ قوم تھے۔ وہ قوم کی عزت اور ترقی کے لیے جستجو اور جدو جہد کو ضروری قرار دیتے تھے۔ یہی دو اوصاف قوموں کی شاندار پیش رفت کی ضامن ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

☆☆☆

مبارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز
حیات جاودان اندر ستیز است

اقبال انسان کی غلامی، محتاجی اور دستِ سوال دراز کرنے کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے۔ ان کے مطابق اشرف المخلوقات کا خطاب پانے والے کو چاہیے کہ وہ منزل تک پہنچنے کے لیے خود اپنا راستہ کھود ڈالے کیونکہ دوسروں کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنا ایک عذاب ہے ۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
اگر از دست تو کار نادر آید
گناہی ہم اگر باشد ثواب است

اقبال شاعرِ ایران مولانا رومیؒ سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے ان کی مثنوی کا بغائر مطالعہ کیا تھا اور اسی مثنوی نے اقبال کی علمی دنیا میں تہلکہ مچایا۔ چونکہ مولوی کی یہ مثنوی پہلوی زبان کا قرآن مانی جاتی ہے۔

مثنوی معنوی مولوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

اقبال مولانا رومی کی علمی عظمت سے حد درجہ متاثر تھے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ رومی کی تعلیمات نے ہی ان کی خاک کو اکسیر بنا دیا ہے ؎

پیر رومی خاک را اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اقبال نہ صرف رومی سے متعلق اپنے اعتقاد کا اظہار کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے فرزند سے مخاطب ہو کر مسلمانوں کی نوجوان نسل سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ مولانا رومی کو غور سے پڑھیں اور ان کی تعلیمات پر ذوق و شوق کے ساتھ عمل پیرا ہو جائیں۔

پیرِ رومی را رفیق راہ ساز

تا خدا بخشد تُرا سوز و گداز

اقبال نے اپنا کلام مختلف عنوانات کے شعری مجموعوں میں پیش کیا ہے۔ اسرار خودی، رموز بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد و مسافر اور ارمغانِ حجاز (آدھا حصہ) اقبال کے مشہور فارسی شعری مجموعے ہیں۔

اسرارِ خودی علامہ اقبال کا اولین فارسی شعری مجموعہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں خودی کی حقیقت، ماہیت، قوت اور صلاحیت کا بیان ہے۔ اقبال نے اس مثنوی میں اپنے خیالات واضح کرنے کے لیے مُلا وجہی کی طرح تمثیل نگاری کا ذریعہ اپنایا ہے۔ چونکہ ''خودی'' کا لفظ فارسی میں محدود اور مختصر معنی کا حامل ہے لیکن اقبال نے اس لفظ کو وسیع ترین معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اسرارِ خودی میں انہوں نے ایک مکمل ضابطۂ حیات کا تصور

پیش کیا ہے اور خودی کو اس کا مرکز قرار دیا ہے۔ وہ فلسفۂ خودی کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ حصولِ تعلیم کے سلسلے میں یورپ میں قیام پذیر تھے۔ خودی ان کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع سے متعلق انگریزی، اُردو اور فارسی تینوں زبانوں میں اپنا زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ چونکہ مسلمان خود سے بیگانہ ہو کر صوفیوں، شاعروں اور مُلاؤں کی دغابازیوں سے گمراہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا اقبال اُن کو خودشناسی کے ذریعے راہِ راست پر لانے میں کوشاں تھے۔

''اقبال وقتی می بیند مسلمانان از ''خود'' رفتہ و مایوس شدہ و بہ مشراب صوفی و افیون شاعر و فریبِ ملا از پای در آمدہ اند در قدم اول میخواہد آنہارا متوجہ خودی خودشان بسازد.....
اقبال می خواہد شمشیر لا الٰہ الا اللہ را در درون مسلمانان بکارد و خودی آن ہارا بیدار کند البتہ مولانای لاہور برائے تقویت خودی و بیدار ساختن آں دستوراتی دارد''۔

چنانچہ علامہ اقبال مولانا رومی اور ان کی مثنوی سے حد درجہ متاثر تھے۔ لہٰذا انہوں نے بھی اسرارِ خودی کے لیے یہی صنفِ سخن اختیار کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس مثنوی کا آغاز بھی رومی کے چند اشعار سے کیا جن میں انہوں نے دلچسپ انداز میں مردِ کامل کا تصور پیش کیا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اقبال اسرارِ خودی کی تمہید میں اپنے ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جو پوری کائنات کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ان کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کے کلام سے بے حس ذرے تک متحرک ہو گئے ہیں۔

''مرشد رومی کے اشعار کے بعد کتاب کی تمہید ہے۔اس میں شاعر نے اپنے آپ کو ایک ایسے خورشید سے تشبیہہ دی ہے جو افق عالم پر ابھی ابھی طلوع ہوا ہے۔اس خورشید کی روشنی سے بحر و بر نا آشنا ہیں اور وہ خود اپنی نمود کے خیال سے لرزہ براندام ہے۔وہ اپنے آپ کو ایک ایسے نغمے سے یاد کرتا ہے جو مضراب سے بے پروا اور آنے والے شاعر کی ندا ہے۔وہ خود کو ایک محشر بداماں عاشق قرار دیتا ہے اور اس لحاظ سے ان لوگوں سے مختلف ہے جو کاروان در کاروان اس صحرا سے ہنگامہ بپا کیے بغیر خاموشی سے گزرتے رہے۔پھر اپنے آپ کو بحر طوفان خیز سے تشبیہہ دی ہے اور ایک ایسی جان پُرسوز کے نام سے یاد کیا ہے جس کے اندر بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔قوت اور تب و تاب کے اس اظہار کے بعد شاعر نے اپنے آپ کو محرم راز حیات کہا ہے جس کی سوزِ نوا سے ذروں میں زندگی کی دھڑکن سنائی دینے لگی ہے۔چنانچہ وہ پڑھنے والے کو نئے اسرارِ حیات کی آگہی کی دعوت یوں دیتے ہیں۔

ذرہ از سوز نوایم زندہ گشت
پر کشود و کرمکِ تابندہ گشت

ہیچ کس رازے کہ من گویم، نہ گفت
ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سفت"

اقبال کے نزدیک دنیا کے انتظام کی بنیاد خود دانی، خود شناسی اور خود آگاہی پر ہے اور زندگی کی مختلف شکلوں کا مدار اور ان کی ترقی خودی کے مضبوط ہونے پر موقوف ہے۔ خودی کی زندگی مقاصد کے پیدا ہونے سے ہے۔ لیکن دست سوال دراز کرنے سے خودی کی وقعت میں کمی آجاتی ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے مسلمانوں کو افلاطون کی تعلیمات سے دامن بچانے کی تلقین کی ہے اور ان کو گوسفندی مسلک کا پیرو قرار دیا ہے ؎

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم

اقبالؒ نے اپنی شاعری کو اثر انداز بنانے کے لیے دلچسپ حکایات بیان کی ہیں۔ سید مخدوم علی ہجویری سے ایک جوان کی دشمنوں کے خلاف شکایت، پیاسے پرندے کی بے قراری، ہیرے اور کوئلے کی کہانی اور شیخ اور برہمن کی حکایت، اسرارِ خودی کو تمثیلی بنانے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

رموز بیخودی اسرارِ بے خودی کے صرف تین سال بعد ۱۹۱۸ء کو شائع ہوئی۔ اس مجموعے کا آغاز بھی مولانا رومی کے اس شعر سے کیا گیا ہے ؎

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

یہ کتاب اصل میں اسرار بے خودی کی شرح کرتی ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسرار بے خودی میں فرد کی اہمیت کو موضوع بنایا۔ اس نظریہ کو بعض لوگ سہی انداز میں سمجھنے سے قاصر رہے۔ لہٰذا اقبال نے فرد اور ملت کے باہمی ربط پر

زور دے کر معاملے کی وضاحت کرنا چاہی۔

''خودی کے نئے تصور نے پڑھنے والوں کے اندر ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ فارسی زبان و ادب میں اس کا نیا مفہوم مستعمل نہ تھا۔ جب علامہ نے فرد کی بے پناہ اہمیت اور اس کے جوہر ذات کی لامحدود استعداد پر اظہار فکر کیا تو اس سے انسانی انا یا خودی کی حقیقت تو ایک نئے خیال انگیز اور انقلابی رنگ میں سامنے آئی۔ لیکن اس میں فرد اور ملت کے باہمی ربط اور حقوق و وظائف پر روشنی نہ پڑتی تھی اور ان کی انفرادی عظمت اور خودی کی قوتِ تخلیق و تسخیر پر جو زور دیا گیا تھا۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ انفرادی خودی پر یہ اصرار اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھیر دے گی۔ رموز بیخودی میں یہ غلط فہمی قطعی طور پر دور کر دی گئی ہے۔ اس میں علامہ نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی اس سے فلسفۂ خودی و بیخودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی کی حیثیت آشکار ہو گئی''۔

رموز بیخودی کی تمہید میں اقبال نے فرد اور ملت کے باہمی رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ فرد کے لیے جماعت کا رابطہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی رحمت ہے کیونکہ فرد کی پہچان اور اس کے جوہر کو اسی رشتے سے کمال حاصل ہے۔ شیطان کا قصہ اس سلسلے میں ایک اہم مثال ہے جو ملت سے تعلقات منقطع کر کے مستحق بہ لعنت ہوا۔ فرد اور قوم ایک دوسرے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں تبادلے میں ایک دوسرے کے لیے عزت کا سامان کرتے ہیں۔ فرد جماعت میں گم ہو کر قوت پاتا ہے جس طرح قطرۂ آب سمندر میں گم

ہوکر وسعت حاصل کرتا ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اقبال ناامیدی، غم اور خوف کو برائی کی جڑیں قرار دیتے ہوئے ان کو زندگی کے لیے ہلاکت خیز قرار دیتے ہیں لیکن توحید میں یقین رکھنے والا انسان بآسانی ان تمام چیزوں پر قابو پا سکتا ہے کیونکہ ملتِ محمدیہ ﷺ کی بنیاد توحید اور رسالت پر قائم ہے ۔

ہر کہ امرِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

عبدالمجید سالک اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں رموزِ بیخودی کے مرکزی خیال پر اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

> ''جس طرح ''اسرار خودی'' میں فرد میں احساس نفس کے نشوو نما کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ اسی طرح اس کتاب میں ''قومی وملی انا'' کے تسلسل کو محفوظ و قائم رکھنے کے رموز و اسرار بیان کیے گئے ہیں ..... اس مثنوی میں علامہ نے ثابت کیا ہے کہ حیاتِ ملی کے لیے بہترین ضابطہ وہ ہے جو اسلام نے مہیا کیا ہے اور اصول اسلامی پر تبصرہ کر کے اس نظریے کو تقویت دی ہے کہ افراد ایک خاص حد تک انفرادی ''انا'' کو قائم و محفوظ رکھ کر اپنی انفرادیت کو ملت کی فلاح پر قربان کر دیں''۔

جرمن کے مشہور ادیب گوئٹے کی تخلیق ''دیوان مغرب'' نے ہی اقبال کو پیام مشرق لکھنے پر آمادہ کیا۔ پیام مشرق ''دیوان مغرب'' کی اشاعت کے

ایک سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ چنانچہ گوئٹے مغربی ماحول سے مایوس اور رنجیدہ خاطر تھے۔ وہ مغرب کی ہنگامہ آرائیوں سے نجات پا کر مشرق کی پُرسکون فضا میں راحت کی سانس لینے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ گوئٹے شروع سے ہی مشرقی تخیلات سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان کو فارسی شعراء کے علم وادب کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا کیونکہ ان کی تخلیقات میں گوئٹے کو پرسکون زندگی کے آثار نمایاں طور پر نظر آئے تھے۔ عہدِ گوئٹے کے کئی برگزیدہ شعراء فارسی شعراء کے کلام سے فیضیاب ہو رہے تھے اور ان کی تحریک کو جرمنی ادبیات میں 'تحریکِ مشرق' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ غالباً اس تحریک کے اکثر شعراء مشرقی تخلیق کاروں کے ہاں سکون اور اطمینان محسوس کرتے تھے۔ دیوانِ حافظ شیرازی نے خاص طور پر گوئٹے کے ذہن کو جھنجھوڑا۔ گوئٹے کی داستانِ حیات لکھنے والے بیل سوشکی نے اس حقیقت کا یوں اعتراف کیا ہے:

''بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی، اور وہی قیود و رسوم سے آزاد! غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہاں معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے

عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (یعنی حافظ نے امیر تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے''۔

گوئٹے حافظ شیرازی کے علاوہ شیخ فریدالدین عطار، شیخ سعدی شیرازی اور فردوس طوسی کے بھی احسان مند تھے۔ انہوں نے اسلامیات کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ مشرقی ماحول سے بڑی حد تک متاثر تھے لیکن مغربیت کے ساتھ ان کی والہانہ محبت میں ہرگز جنبش تک نہیں آئی۔ گوئٹے نے مغربی دیوان کی وساطت سے جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی یہی کوشش بعد میں مشرقی تحریک کہلائی۔ گوئٹے کے بعد جن جرمنی شاعروں نے اس تحریک کو استحکام بخشنے کی سعی کی ان میں پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پلاٹن نے ادبی فوائد حاصل کرنے کے لیے فارسی زبان سیکھ لی۔ اس نے غزلیں اور رباعیاں لکھیں۔ نپولین پر ان کا ایک قصیدہ ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

''با این ہمہ باید گفت کہ گوتہ در دیوان غربی روح ایرانی را در کالبد ادبیات آلمانی دمیدہ است۔ سپس مولانا اقبالؒ بہ شعرایِ دیگر آلمانی کہ از گوتہ پیروی کردہ و روح ایرانی را در شعر خود جای دادہ اند اشارہ فرمودہ و یادآور گردیدہ کہ این شاعران آثار مشہور ادبی ایران از قبیل مخزن الاسرار نظامی، آثار مولانا روم، بہارستانِ جامی، کلیات امیر خسرو دہلوی، گلستان سعدی،

آثار خیام وفردوسی، مناقب العارفین، عیارِ دانش، منطق الطیر
را مورِدِ توجہ قرار دادہ وحتی وقایع تاریخی اسلام وایران از قبیل
داستان محمود غزنوی وفردوسی وحملہ محمود بسومنات را بنظم کشیدہ
اند''۔

اقبال نے پیامِ مشرق کو افغانستان کے امیر حضرت امان اللہ خان کے نام منسوب کیا ہے۔ جس نے اپنے ملک کو انگریزوں کے اثر ورسوخ سے آزاد کرنے کے لیے بغاوت کا اعلان کیا۔ اس تغیر وتبدل کے نتیجے میں افغانستان کے مسلمانوں میں یہ اُمید جاگ اُٹھی کہ امان اللہ خان ملک میں اسلامی طرز حکومت قائم کر کے اس کی ترقی اور پیش رفت یقینی بنائیں گے اور اس تحریک سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بھی حوصلے بلند ہوں گے۔ علامہ اقبال کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ امان اللہ خان بہادر اور ذہین ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہیں۔ ''پیامِ مشرق'' کی تمہیدی نظم میں اقبال افغانی حکمران امان اللہ خان کو نصیحت کے طور پر کچھ اہم باتیں گوش گذار کرتے ہیں۔

اے امیر کامگار اے شہر یار
نوجوان و مثل پیراں پختہ کار
چشم تو از پردگیہا محرم است
دل میان سینہ ات جام جم است
ہمتِ تو چوں خیال من بلند
ملت صد پارہ را شیرازہ بند
ہدیہ از شاہنشہان داری بسی
لعل و یاقوت گراں داری بسی

اے امیر ابنِ امیر، ابنِ امیر
ہدیہ از بے نوائے ہم پذیر

''پیام مشرق'' چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''لالۂ طور'' ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) رباعیات پر مبنی ہے۔ اقبال نے ان رباعیات میں ایران کے مشہور رباعی گو شاعر بابا طاہر عریان کا طرز اپنایا ہے۔ ان رباعیات میں اقبال نے مختلف مسائل ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں عشق ان کا ایک مخصوص موضوع رہا ہے۔ عشق اقبال کے نظام فکر و عمل میں خودی کی طرح بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان رباعیات میں انہوں نے عشق کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی لامحدود عظمت پر بھی رائے زنی کی ہے۔

بہ برگ لالہ رنگ آمیزی عشق
بجان ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکدان را واشگافی
درونش بنگری خونریزی عشق!
نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید، ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم!

پیامِ مشرق کے دوسرے حصے کا عنوان ''افکار'' رکھا گیا ہے۔ اس حصہ میں اکاون (۵۱) نظمیں موجود ہیں۔ اقبال نے ان نظموں میں فلسفہ زندگی کے کئی پہلو اُجاگر کئے ہیں۔ گل نخستین، ہلال عید، تسخیر فطرت، انکارِ ابلیس، صبح

قیامت، فصلِ بہار، کرمِک شب تاب، نغمۂ ساربان حجاز، غنی کاشمیری اس حصے کی مشہور نظمیں ہیں۔

مجموعے کا تیسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جن کی تعداد پنتالیس (۴۵) ہے۔اس حصے کی بیشتر غزلیں ایران کے مشہور غزل گوشاعر خواجہ حافظ شیرازی کی زمین میں کہی گئی ہیں۔اقبال نے ان غزلیات میں فلسفہ حیات کے مختلف پہلوؤں کو حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اقبال نے بعض غزلیات میں مسلمانوں کے مسائل کواُجاگر کرنے کی سعی کی ہےاوران کے عروج وزوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کا مستقبل سنوارنے کے روشن امکانات کی نشاندہی کی ہے ۔

نشود نصیبِ جانت کہ دمی قرار گیرد
تب و تابِ زندگانی بتو آشکار بادا

پروفیسر محمد منوراقبال کے طرز بیان سے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''در غزلِ اقبال ما امتزاج ہرسہ سبک معروف شعر ایران (سبکِ عراقی، سبکِ خراسانی وسبکِ ہندی) رامی بینیم ولی چیزی کہ سبکِ مخصوص اقبال را بوجود آوردہ است، تازہ فکری و ترکیب اصطلاحاتِ جدید ونفوذ وافکار وطرزِ بیان متفکرین مغرب می باشد۔اقبال بدونِ اینکہ روح مشرق رااز دست بدہد، سالمترین وجالب ترین صفاتِ ادبیاتِ جدید مغرب راکسب کردہ واین امر برمحبوبیت شعروفکرش درمشرق ومغرب افزودہ است۔نہ تنہا اسالیب مخصوصِ ایران بلکہ طرزِ فکرمشرق و

مغرب را با ہم پیوند دادہ و وحدت و یگانگی معنوی قدیم و جدید
را بہ بہترین وجہی با یکدیگر تطبیق دادہ و براستی چہ درست تشخیص
دادہ است''۔

''نقشِ فرنگ'' پیام مشرق کا چوتھا اور آخری حصہ ہے۔ مغربی افکار اور وہاں کی سیاست اس حصے کا خاص موضوع ہے۔ اقبال نے اس حصے میں مغرب کے مشہور مفکر گوئٹے کو مشرق کی طرف سے پیغام سنایا ہے۔ اقبال نے مغربی طرزِ زندگی اور عقیدوں کا تجزیہ کر کے ان کے اندر پائی جانی والی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے ۔

از من اے باد صبا بگوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشاد است گرفتار تر است
عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است

اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کی اہمیت اور اس کے ولولہ انگیز اور انقلاب خیز ارادوں کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ اقبال نے پیام مشرق کو اثر انداز بنانے کے لیے عالمی سطح کے مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن، نیٹشا، حکیم آئن سٹائن، بائرن، پٹوفی، لینن، لاک، کانٹ، برگساں، برونگ، غالب اور رومی۔

زبورِ عجم اقبال کی فارسی شاعری کا چوتھا مجموعہ ہے جس کی اشاعت ۱۹۲۷ء کو عمل میں لائی گئی۔ زبور اصل میں ایک مذہبی کتاب کا نام ہے جو مشہور پیغمبر حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی تھی جو کسی اور زبان میں تھی۔ چونکہ اقبال اپنے اس شعری مجموعے کو بھی الہامی کتاب ہی تصور کرتے تھے اور یہ مجموعہ عجمی

(فارسی) زبان میں ہے لہٰذا انہوں نے اس کا نام زبور عجم ہی رکھا۔ زبور عجم اصل میں غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل غزلیات کی کل تعداد پچھتر (۷۵) ہے۔ مجموعہ کے آخر میں گلشن راز جدید اور بندگی نامہ عنوان کے تحت دو مثنویاں بھی شامل ہیں۔ اس شعری مجموعے میں علامہ اقبال اہلِ مشرق سے مخاطب ہیں۔ ابتداء میں اقبال زبورِ عجم کا مطالعہ کرنے والوں سے نصیحت کے طور پر فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے کے لیے باطن کی آنکھ وا کریں تا کہ اسرارِ الٰہی ان پر عیاں ہوں۔ چونکہ دوستانِ خداوند نے باطن کی آنکھ کھول کر ہی میدانِ عشق کا دور دراز سفر طے کر کے اپنی منزل پائی۔ طلب اور اُمید کا دامن تھامے رکھنے سے ممکن ہے کہ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ آئے گا جب آپ کی مٹی سونے میں بدل جائے گی۔

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے
وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامنِ امید زدست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

تمہیدی اشعار کے بعد اقبال خدائے عزوجل کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسے قلب و نظر سے نوازے جو کائنات کے ذرے ذرے میں اس کی جلوہ گری سے فیض یاب ہوں۔ ان کے کلام کو آفاقی بنائے، مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑہ پار کرانے میں مدد فرمائے اور ان کی مٹی کو حضرتِ داؤدؑ کے نغمہ کے نور سے روشن کر دے۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے

ایسی سریلی آواز سے نوازا تھا کہ جب وہ الہامی کتاب 'زبور' کی قرأت کرتے تھے تو جن، انسان، درندے، چرندے اور پرندے دم بخود ہو کر رہ جاتے تھے۔ اقبالؒ زبورِ عجم میں اسی طرح کی اثر اندازی پیدا ہونے کے لیے دُعا فرماتے ہیں ؎

یارب درونِ سینۂ دل باخبر بدہ
دربادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

☆☆☆

خاکم بہ نور نغمۂ داؤدؑ بر فروز
ہر ذرۂ مرا پر و بال شرر بدہ

اقبال نے فنِ غزل گوئی کو اس قدر وسعت بخشی ہے کہ اس میں ہر طرح کے مضامین بیان کرنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے خود عظمتِ انسان سے لے کر شانِ خداوندی تک کے تمام پہلوؤں پر رائے زنی کی ہے۔ ملتِ اسلام تک اپنا آفاقی پیغام پہنچانے کے لیے بھی انہوں نے صنفِ غزل کا انتخاب کیا ہے۔

''اقبال نے زبانِ غزل کو بے انتہا وسعت دی۔ ان کے تتبع میں غزل میں دنیا بھر کے مضامین سمونا، ہنرمندی ہے۔ ان کی غزلیں اس قابل ہیں کہ دوسرے شاعران کی تقلید کریں اور پیغام و تغزل کو مخروج و مخلوط کرنے کی کوشش کو آگے بڑھائیں۔ اقبال کا یہ بڑا کمال ہے کہ غزل میں ہر قسم کے مضامین ادا کر دیے مگر زبان کے لوچ میں فرق نہ آنے دیا۔ شاعر مشرق کا مقصد ابلاغ تھا، نہ کہ ہنرنمائی مگر ابلاغِ پیغام نے غزل کے

تقاضوں کو اتنا معمولی مجروح کیا ہے کہ ہر کہ ومہ اس امر کی
نشان دہی بھی نہیں کرسکتا''۔

اقبال نے زبورِ عجم کی غزلیات میں حسنِ مطلق اور انسان سے خطاب فرمایا ہے۔ انسان اور خالقِ کائنات کے باہمی رشتے کا اظہار انتہائی ذوق و شوق اور محبت سے کیا ہے۔ ان غزلیات میں سوز وساز کے ساتھ ساتھ لذتِ غم کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں محسوس کرنے والی موسیقی بھی موجود ہے۔ اقبال ہمیشہ مسلمانوں کی بہبودی اور بہتری کے لیے متفکر تھے۔ انہوں نے اپنی غزلیات میں مسلمانوں کو اسلاف کے کارہائے نمایاں یاد دلا کر اپنے مستقبل کو سنوارنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ مسلمان دیگر قوموں کی طرح مادہ پرستی کے جنون میں بے قابو ہو چکے ہیں اور ان میں اپنے بزرگوں کے نام و نشان برقرار رکھنے کی صلاحیت مفقود ہو رہی ہے۔ وہ مغرب کے تہذیب و تمدن، رہن سہن اور فلسفہ کی نقالی کرنے میں لذت محسوس کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی فکر اور تشخص کو فراموش کر چکے ہیں۔ اس طرح وہ اپنا مذہب بھول کر روایت پرستی کے مذہب کے پیروکار بن بیٹھے ہیں ۔

فکر گرہ گشا غلام دین بروایتی تمام
زانکہ درون سینہ ہا دل مدفنی است بی نشان

زبورِ عجم میں شامل مثنوی ''گلشنِ راز جدید'' اصل میں محمود شبستری کی مثنوی ''گلشن راز'' کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ گلشن راز کی تاریخ کے مطابق ہرات کے ایک عالم اور بزرگ میر حسین نے تبریز کے عالموں کی طرف سترہ سوال بھیج کر جواب طلب کئے۔ اُن دنوں تبریز علم و عرفان کا گہوارہ تھا اور عالمی سطح کے عالم و فاضل یہاں تربیت پاتے تھے۔ یہاں کے عالموں نے میر حسین

کے سوالات کا جواب دینے کی ذمہ داری محمود شبستری کو سونپ دی اور انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان سوالات کا تسلی بخش جواب دیا۔ یہ جوابات بعد میں گلشن راز کے نام سے شائع ہوئے۔ ان تمام سوالات کا بنیادی موضوع اسرار و رموز ہیں اور ان میں وحدۃ الوجود سے متعلق نکات اُبھارے گئے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے ان ہی سوالات کا جواب جدید انداز میں لکھا۔ انہوں نے سترہ میں سے فقط نو سوالات کا جواب لکھا جو گلشن راز جدید کے نام سے شائع ہوئے۔ اس مثنوی کے تمہیدی اشعار میں بھی اقبال نے مسلمانوں کی غفلت، لاپرواہی اور بے راہ روی کا رونا رویا ہے۔ ان کی نظروں میں مشرقی مسلمانوں کے اندر جوش و جذبہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے لہٰذا وہ حقیقی زندگی کی لذت و لطف سے ناآشنا ہیں ؎

ز جان خاور آں سوز کہن رفت
دمشق وا ماند و جانِ او زتن رفت
چو تصویرے کہ بے تار نفس زیست
نمی داند کہ ذوق زندگی چیست
دلش از مدعا بیگانہ گردید
نے او از نوا بیگانہ گردید

زبور عجم میں شامل دوسری مثنوی کا عنوان ''بندگی نامہ'' ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے غلاموں کی زندگی میں پائے جانے والے خلفشار پر تبصرہ کیا ہے۔ غلامی انسانی قلب و نظر کی موت کا سامان پیدا کرتی ہے۔ اس سے جوانی میں بڑھاپا اور بڑھاپے میں کڑواہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ قوم کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے اور اس کے ٹکڑوں میں ٹکراؤ کی صورتِ حال پیش کرتی ہے۔ غلامی

کے زیر سایہ ابھرنے والے فنون زندگی بجائے موت کا پیغام سناتے ہیں۔ ایسے نغموں میں وجود کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے اور ایسی مصوری میں متحرک کرنے کی لیاقت نہیں ہوتی ہے ۔

نغمہ گر معنی نہ دارد مردہ ایست
سوزِ او از آتش افسردہ ایست

☆☆☆

ہمچنان دیدم فن صورت گری
نی براہیمی درو نی آزری

بندگی نامہ کے جملہ مفہوم بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالشکور احسن اپنی تصنیف ''اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' میں رقمطراز ہیں:

''اقبال نے بندگی نامہ میں غلامی کی اذیت ناک اور روح کش فضا کا نقشہ نہایت دردمندانہ انداز میں کھینچا ہے۔اس کے بعد شاعر نے غلاموں کے فنونِ لطیفہ سے بھی بحث کی ہے اور مردانِ آزاد کے فن تعمیر سے بھی۔ غلام اقوام کی موسیقی پر موت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔اس میں نہ سوز کی دولت ہوتی ہے اور نہ اُمید کی جھلک، نہ ذوقِ فردا اور نہ لذتِ امروز۔ ہاں بیزاری کا پیغام ضرور ملتا ہے اور ایک مریضانہ غم کا شدید احساس اس پر یقیناً طاری ہے۔اس کے بعد شاعر اپنی غلام قوم کے فنکاروں کو فن کا ایک صحت مند، توانا اور جاندار تصور پیش کرتا ہے ..... غلامی میں جسم روح کی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے اور تن بے جان سے کسی خیر کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔

غلامی میں ذوق ایجاد و نمود رخصت ہو جاتا ہے۔ غلام فنکار تقلید
میں پناہ لیتا ہے اور پامال و فرسودہ راہیں اس کے دل کو لبھاتی
ہیں۔ ایسا فن آرزو کی موت ہے''۔

''جاوید نامہ'' اقبال کا ایک خیالی سفر نامہ ہے جس میں وہ ان حالات کو بیان کرتے ہیں جن سے وہ عالم ارواح میں دوچار ہوتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۹۳۲ء کو شائع ہوئی جب پوری دنیا افراتفری اور اقتصادی بدحالی کی گرفت میں جھکڑی ہوئی تھی۔ مذہب اور اخلاق سے بیگانگیت عام ہو چکی تھی۔ معاشی بدحالی عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اسٹالین اپنے ملک روس میں بید ینیت کی آبیاری کرنے میں مصروف تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جنم لینے والے قتل و غارت، لوٹ مار، آتش زنی، وحشت اور بربریت نے انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اقبال کا ملک ہندوستان بذات خود انگریزوں کے تسلط میں آ کر اپنی شان و شوکت کھو چکا تھا۔ عالمی سطح پر رونما ہونے والے ان حالات نے انسان کے حقیقی مقام کو مجروح کیا تھا۔ اقبال نے اسی پریشان حال انسان کو اپنی اصلیت اور حقیقت سے باخبر ہونے کے لیے یہ مثنوی لکھی۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنے خیالات کو ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کے خواہشمند تھے تاکہ یہ زود اثر ثابت ہو سکیں۔ لہٰذا انہوں نے اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کا وہ طریقہ اظہار اپنایا جو اس نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "Divine Comedy" میں اپنایا تھا۔ اس طریقے کی کتاب لکھنے کا تصور پیغمبر اسلام نبی اکرم ﷺ کے معراج سے حاصل کیا۔ علاوہ ازیں حضرت محی الدین ابنِ عربی کی مشہور کتاب ''فتوحات مکہ'' بھی ان کے پیش نظر تھی۔

''مشرق کے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہسپانیہ کے

بعض مستشرقین کی تحقیقات نے اہلِ مغرب پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح روشن کردی ہے کہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا ماخذ اولاً وہ احادیث نبوی ﷺ ہیں جن میں معراج کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ثانیاً تصوف اور ادب اسلامیہ کی وہ کتابیں ہیں جن میں اسرارِ معراج نبوی پر روشنی ڈالنے کے علاوہ بعض صورتوں میں مصنفین نے خود اپنی سیاحت علوی اور مشاہدۂ تجلیات کا ذکر کیا ہے۔ موخرالذکر میں شیخ اکبر حضرت محی الدین ابنِ عربی کی مشہور کتاب ''فتوحاتِ مکہ'' اور ابوالعلا معری کی تصنیف ''رسالۃ الغفران'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں''۔

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے جس میں شاعر خالقِ کائنات خدائے بزرگ و برتر کی شان وشوکت اور عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے ساتھ اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

مثنوی کی تمہید میں شاعر نے اُس منظر کی عکاسی کی ہے جب سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی سرمئی اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ خود سمندر کے کنارے پر تنہا بیٹھے ہوئے محرم راز کی تلاش کرتے ہیں اور رومی کا یہ شعر گنگناتے ہیں ؎

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست
بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

اسی دوران مشہور فارسی شاعری اور مثنوی معنوی کے تخلیق کار مرحوم مولانا رومیؒ کی روح پہاڑ کے اُس پار سے نمودار ہوتی ہے۔ اُس کے نمودار ہوتے ہی

اقبال کو سارا ماحول روشن ہوتے نظر آتا ہے۔ یہ دونوں باہم راز و نیاز کی باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اقبال رومی کو اپنا مرشد تسلیم کرتے ہوئے اُن سے نفع بخش رہنمائی کی اُمید رکھتے ہیں۔ مرشد رومی اقبال کو عشقِ حقیقی کی عظمت و شان و شوکت سمجھاتے ہیں تا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند یکسر مٹ جائے۔ عشق ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو ہر کہہ و مہہ پر حکمران بنا دیتی ہے۔ زمین اور سمندر کیا آسمان اور چاند، سورج اور ستارے اُس کی تسلط میں آتے ہیں۔

زور عشق از باد و خاک و آب نیست
قوتش از سختی اعصاب نیست
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر
ہم درون خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است
کارِ او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبین
ہر دو عالم عشق را زیر نگین

جاوید نامہ ایک مکالماتی نظم ہے اور صاحب مثنوی نے تاریخ ساز شخصیتوں کو اس مثنوی کے کردار منتخب کئے ہیں جو باہمی گفتگو سے شاعرِ مشرق کو جذبات، احساسات اور تفکرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گوتم بدھ اور رقاصہ، شیطان اور زرتشت مکالماتی نظمیں ہیں۔ اقبال زندہ رود کے روپ میں عالم ارواح کی سیر کرتے ہیں (زندہ رود ایران میں ایک دریا کا نام ہے) زیارت ارواح کے دوران اقبال جن شخصیات سے ہمکلام ہوتے ہیں ان میں جمال

الدین افغانی، سید حلیم پاشا، فرعون، سوڈانی درویش، منصور حلاج، اسد اللہ خان غالب، قرۃ العین طاہرہ، ابلیس، نطشے، شرف النساء، امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، ملا طاہر غنی کاشمیری، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، سلطان شہید اور ناصر خسرو علوی شامل ہیں۔

چنانچہ علامہ اقبال نسلاً کشمیری تھے اور ان کو کشمیر اور کشمیریت کے ساتھ گہری محبت تھی۔ اپنے خیالی سفر کے دوران اقبال زندہ رود کے روپ میں کشمیر کی ایک عظیم مذہبی شخصیت حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ سے ملاقی ہوتے ہیں۔ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی (شاہ ہمدان) اصل میں ہمدان کے تھے اور مسلم ممالک کے سفر کے دوران وہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں کشمیر تشریف لائے جہاں اس وقت برہمنوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ شاہ ہمدان نے کشمیر میں اسلام پھیلانے کے لیے اپنا کافی وقت صرف کیا۔ چنانچہ واردِ کشمیر ہونے کے وقت سات سو سادات ان کے ہمراہ تھے جنہوں نے شاہِ ہمدان کی ہدایت پر یہاں کے طول وارض میں اسلام پھیلانے کی کاروائی شروع کی۔ نتیجتاً کشمیر کے لاتعداد برہمنوں نے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا۔ شاہِ ہمدان نے کشمیر کو نہ صرف مذہب و دین کے زیور سے آراستہ کیا بلکہ ان کے ساتھ آنے والے صنعت کاروں نے کشمیریوں کو نقاشی، خطاطی، قالین سازی، پارچہ بافی وغیرہ کا ہنر سکھایا۔ یہ فنون ابھی تک کشمیریوں کے بہترین ذرائع آمدنی ہیں۔

سید السادات، سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیر امم!
مرشد آں کشور مینو نظیر

میر و درویش و سلاطین رامشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر
با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

زندہ رود شاہ ہمدان کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک ایسے سوال کا جواب طلب کرتے ہیں جن پر ہزاروں سال سے بحثیں ہوتی رہیں لیکن سوال سوال ہی رہا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اپنی عبادت کرنے کا حکم صادر فرمایا تو اس عبارت میں رخنہ ڈالنے کے لیے شیطان کو کیوں پیدا کیا۔

از تو خواہم سریزدان را کلید
طاعت از ماجست و شیطان آفرید
زشت و ناخوش راچناں آراستن!
در عمل از مانکوئی خواستن!
از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ!
با قمار بدنشین بازی کہ چہ!
مشتِ خاک و ایں سپہر گرد گرد
خود بگو می زیبدش کاری کہ کرد
کار ما افکار یا آزار ما
دست با دنداں گزیدن کار ما

شاہِ ہمدان اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اے زندہ رود (اقبال) اللہ تعالیٰ کا جو بندہ خود شناس ہوتا ہے۔ وہ نقصان سے بھی نفع حاصل

کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان کے ساتھ مراسم بڑھانے سے انسان ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ دست بہ گریبان ہوکر وہ فائدے میں رہتا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ شیطان کے ساتھ رزم آرائی کریں کیونکہ آپ ایک ایسی تلوار ہیں جس میں کوئی تیزی نہیں ہے جب کہ شیطان سنگِ فسن کی طرح ہے جس کے ساتھ ٹکرا کر آپ اپنے اندر تیزی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تخلیق شیطان انسان کی پیش رفت اور جدو جہد کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

بندۂ کہ از خویشتن دارد خبر
خبر آفریدِ منفعت را از ضرر!
بزم با دیو است آدم را وبال
رزم بادیو است آدم را جمال
خویش را بر اہریمن باید زدن
تو ہمہ تیغ و آں ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تا اُفتد ضرب تو سخت
ورنہ باشی در دوگیتی تیرہ بخت

علامہ اقبال ہمیشہ وادی کشمیر کے سیاسی حالات سے پریشان تھے۔ ان کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی اس شاندار وادی کو محض چند سکوں کے عوض ایک غیر مسلم حکمران کو فروخت کیا جس نے اُن کو سوائے غم اور دُکھ کے کچھ بھی نہیں دیا۔ شاہِ ہمدان کے ہم کلام ہونے کے دوران اقبال ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کے سیاسی حالات پر ماتم کناں ہیں۔ اہل کشمیر نے اپنے فن اور ہنر مندی کی وجہ سے پوری دنیا میں ایک خاص نام کمایا ہے لیکن اس کاریگری پر دوسرے قابض ہو چکے ہیں۔ ڈوگرہ حکومت نے ان

کی آزادی کو سلب کر کے رکھا ہے۔ان کے جذبات کو زمین بوس کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قوم ہمیشہ محکوم اور مظلوم نہ تھی بلکہ اس میں دشمنوں کی صفیں توڑنے کی صلاحیت موجود تھی۔

زیر گردون آدم آدم را خورد
ملتی بر ملتی دیگر چرد
جان از اہلِ خطہ سوزد چوں سپند
خیزد از دل نالہ ہاے درد مند
زیرک و دراک و خوش گل ملتی است
در جہاں تردستی او آیتی است
ساغرش غلطندہ اندر خون اوست
در نی من نالہ از مضمون اوست
از خودی تابی نصیب افتادہ است
در دیار خود غریب افتادہ است
دست مزد او بدست دیگران
ماہی رود بہ شست دیگراں
کاروانہا سوی منزل گام گام
کار او نا خوب وبی اندام و خام
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد
آتشی اندر رگ تاکش فسرد
تانہ پنداری کہ بود است این چنین
جبہہ را ہموارہ سود است این چنین

در زمانی صنف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پردم بورہ است

شاہ ہمدان اقبال کی مایوسی کو اُمید میں بدل ڈالنے کے لیے ان سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ زندہ اور برف سے ڈھکے ہوئے کشمیر کے پہاڑوں پر نگاہ ڈال اور دیکھ اس کے چنار کے پتوں کو جو آگ سے بنے ہوئے ہاتھوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کے پتھروں سے اب بھی موسم بہار میں لعل پھوٹتے ہیں۔ بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گھالوں کی طرح اڑتے ہیں جیسے کوئی دھننے والا اپنی کمان سے روئی اڑاتا ہے۔ یہاں کے پہاڑ، دریا اور غروب ہونے والا آفتاب اللہ کی عظمت اور شان کا مظاہرہ کر رہے ہیں لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ کشمیر کی مٹی نے سلطان شہاب الدین جیسی شخصیت پیدا نہیں کی جو دوبارہ اس خطہ کشمیر پر حکومت کرتا۔ یعنی اگر ایسی کوئی شخصیت اس سرزمین سے پیدا ہوتی ہے تو پرانے دن ضرور لوٹ آئیں گے۔

کوہ ہائے خنگ سارِ او نگر
آتشیں دستِ چنار او نگر!
در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ
خیزد از خاکش پکی طوفانِ زنگ
مکہ ہای ابر در کوہ و دمن
پنبہ پراں از کمانِ پنبہ زن!

اسی دوران ایک دیوانے کی آواز سنائی دیتی ہے جو بادصبا سے درخواست کرتا ہے کہ اگر اس کا گذر جینوا کی طرف ہو جہاں یو این او کا دفتر واقع ہے تو مجلس اقوام متحدہ کو میری فریاد سنانا۔ ہندوستان پر قبضہ کرنے والے مکار اور

انسانیت دشمن انگریز حاکموں نے اپنے عہدِ حکومت میں کشمیری مسلمانوں کی تذلیل کے لیے انہیں کچھ روپیوں کے عوض ایک ہندو حکمران کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اُس نے وہاں کی اکثریتی مسلمان آبادی پر ایک طویل عرصہ تک جو ظلم ڈھائے وہ انسانی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کی ندیاں دوراس کے پھولوں کی کیاریاں تک فروخت کر ڈالیں۔

بادِ صبا اگر بہ جینوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوامِ باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومی فروختند و چہ ارزاں فروختند

اقبال اور شاہ ہمدان کی گفتگو کے دوران غنی کاشمیری بھی نمودار ہوتے ہیں۔ غنی کاشمیری کا شمار کشمیر کے ان بلند پایہ فارسی شاعروں میں ہوتا ہے جن کی ادیبانہ کارکردگی کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔ وہ بھی اقبال کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندوستان کو آزادی دلانے میں جن سیاسی مفکروں نے آزادی دلوانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ وہ دونوں کشمیری نسل کے تھے یعنی موتی لعل نہرو اور ان کے فرزند پنڈت جواہر لعل نہرو۔ اے اقبال آپ آزادی کی رحمت سے نا اُمید نہ ہوں کیونکہ ہمارے اندر یہ چنگاری ابھی بھی سلگ رہی ہے۔ آپ اَے اقبال کشمیریوں سے نا اُمید کیوں ہیں؟ ان کے سینوں میں موجود دل ہرگز مردہ نہیں ہیں۔ آپ ان کشمیریوں کے اندر وہ روح پھونک دے جوان کو ہر طرف سے بے نیاز کر کے صرف غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ کر دے۔

کاروان ہا را صدای تو درا
تو ز اہلِ خطہ نومیدی چرا؟

دل میان سینہ ی شان مردہ نیست
اخگر شان زیر یخ افسردہ نیست
تازہ آشوبی فکن اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

ارمغان حجاز علامہ اقبال کے آخری ایام کی تخلیق ہے جوان کے آغوش مرگ میں جانے کے بعد ۱۹۳۸ء کو شائع ہوئی۔ علامہ اقبال حج کو جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس دوران زیارت حج کا خیالی سفر انہوں نے اسی شعری مجموعے میں پیش کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ فارسی زبان میں ہے اور دوسرا اُردو زبان میں۔ چونکہ یہاں فقط ان کی فارسی شاعری سے متعلق جانکاری دلانا مطلوب ہے لہٰذا فارسی کلام پر ہی تبصرہ کرنے کی سعی ہوگی۔ مجموعہ کی ابتدائی رباعیات میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو موضوع بنایا ہے۔ وہ مسلمان جو راہِ حق میں ہر طرح کی مشکلات اور مصائب جھیلنے میں خوشی اور مسرت پاتے تھے اب ناپید ہو گئے ہیں۔ اب جو مسلمان باقی رہ گئے ہیں وہ نام کے مسلمان ہیں کام کے نہیں۔ اللہ کے آخری دین کو ماننے والے مسلمان انتہائی خراب حالت میں ہیں جب کہ غیر مسلم خوشحال اور شادمان ہیں۔ القصہ جاوید نامہ علامہ اقبال کے افکارِ عرفانی اور سیاسی و اجتماعی نظریات کی حامل ہے۔ انہوں نے روحانی اور فلسفیانہ امور پر کھل کر بحث کی ہے اور دردِ ملت کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس کا درماں بھی بتایا ہے۔

> ''جاوید نامہ حاوی دقیق ترین و لطیف ترین افکار عرفانی و نظرات سیاسی و اجتماعی اقبال است۔ جاوید نامہ بہترین معرف وسعتِ نظر، ظرافت اندیشہ وطبع لطیف وشعر بدیع اقبال

است۔ تعبیر و تفکرات و رؤیا ہای روحانی اقبال درین منظومہ عجیب بہترین معرف بنوع و عظمتِ روح این متفکر بلند پایہ مشرق است۔ روی ہای فلسفی اقبال درین کتاب چناں بدیع و خیال انگیز و گرم و گیرا ست کہ در وصف نمی گنجد و تنہا با مطالعہ دقیق و فہم عمیق آں میتوان بہ عظمت آن پی برد''۔

چونکہ علامہ اقبال جانتے ہیں کہ ان حالات کے لیے مسلمان خود ذمہ دار ہیں کیونکہ وہ دین الٰہی اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے بہت دور گئے ہیں لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ ان کا کلام اس قدر ہنگامہ خیز ہو کہ باطل کی زمین زلزلے سے لرز اٹھے اور ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جہاں فقط حق کا بول بالا ہو۔

زمن ہنگامہ دہ این جہاں را
دگر گون کن زمین و آسمان را
ز خاک ما دگر آدم بر انگیز
بکش این بندۂ سود و زیان را

حضور رسالت ﷺ عنوان کے تحت رباعیات میں اقبال نے پیغمبر اسلام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے عشق رسولؐ کی وضاحت کی ہے اور مسلمانوں کی ابتر حالی کا رونا رویا ہے۔ مسلمان تنگدستی میں بھی حیات شاہانہ بسر کرتا ہے اور اللہ کے بغیر ہر چیز سے بے نیاز ہوتا ہے۔ لیکن وہ مسلمان آج اپنی مسلمانی شان سے محروم ہو گیا ہے اور اسلام کا ذوق و شوق بھی اس کے اندر دم توڑ چکا ہے۔ ان تمام گمشدہ چیزوں کی بازیابی ممکن ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں پر نظر عنایت فرمائیں۔

مسلماں آں فقیر کج کلاہی
رمید از سینۂ او سوزِ آہی
دلش نالد چرا نالد؟ نداند
نگاہی یا رسول اللہ نگاہی

شاعر ہندوستان کی غلامی کا بھی ذکر کرتے ہیں جہاں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ وہ غلامی کی رات کی تاریکی میں غرق ہیں اوران کواُمید کی کوئی صبح نظر نہیں آتی ہے۔ لہٰذا اے رسول اللہؐ ہم مظلوم مسلمانان ہند کی طرف ایک نگاہ کرم فرماتا کہ ہم انگریزوں کے ظلم وستم سے آزاد ہوکرامن و سکون کا سانس لے سکیں اورترقی کے دروازے ہم پر کھل جائیں۔ اقبال پیغمبر اسلام کے بعد بارگاہِ خداوندی میں بھی مسلمانوں کی بہبودی اورخوشحالی کے لیے دست بدعا ہیں۔

شب ہندی غلاماں را سحر نیست
بایں خاک آفتابے راگزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ شرق
مسلمانی ز ما بیچارہ تر نیست
چہ گویم زاں فقیرے دردمندے
مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا این سخت جان را یاد بادا
کہ اُفتاد است از بامِ بُلندے

حضور ملت (امت مسلمہ کی جناب میں) کی رباعیات میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کومتحرک ہوکرترقی کے منازل طے کرنے کی اپیل کی ہے اور

اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد کر کے کارہائے نمایاں انجام دینے کی تلقین کی ہے۔ ''خودی'' عنوان کے تحت کہی گئی رباعیات میں شاعر نے مسلمانوں کو خود شناسی کے فلسفے میں پوشیدہ نکات سمجھائے ہیں۔ صوفی و ملا سے متعلق رباعیات میں انہوں نے ان ملاؤں اور صوفیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے جو جاہل، فریب کار، پیشہ ور، دین فروش، مصلحت بین اور اغراض پسند ہیں۔ لیکن ان صوفیوں سے فیض ہونے کی تاکید کی ہے جو شریعت اور طریقت کے اصولوں کے مطابق چلتے ہیں۔

گرفتم حضرت ملا ترش روست
نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با این مسلمانی کہ دارم
مرا از کعبہ می راند حق اوست

''دخترانِ ملت'' میں شاعر نے مسلمان بیٹیوں سے مخاطب ہو کر ان کو ملت کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن قرار دیا ہے لہٰذا ان کو اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے قوم کی بیٹیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق مصروف بہ عمل ہونا چاہیے۔ ان کو مغرب کی بے حیائی، بے شرمی اور بداخلاقی سے دور رہنا چاہیے۔ ظاہری حسن کی نمائش اور زیب و زینت کے اظہار سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ یہ چیزیں اسلام نے حرام قرار دی ہیں۔ اپنے جسم کی نمائش کرنے کے بجائے سیرت اور کردار کے حُسن کو دوبالا کرنا چاہیے۔ اپنے عورت پن سے متنفر ہو کر مرد کا حلیہ اختیار کرنے کی کوشش سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

بہل ای دخترک این دلبری ہا
مسلمان را نہ زیبد کافری ہا

منہہ دل بر جمال غازہ پرورد
بیاموز از نگاہ غارت گری ہا

علامہ نے تصور تعلیم پیش کرتے ہوئے موجودہ تعلیمی نظام کو یکستر مسترد کردیا ہے کیونکہ ان تعلیمی اداروں میں نئی نسل کو روحانی غذا میسر نہیں ہوتی ہے۔ان کا نصاب اور درس وتدریس کا طریقہ کار بداخلاقی کے بالکل قریب ہے۔ چنانچہ جدید تعلیم کا نظام مغرب کی پیدا کردہ ہے لہٰذا اس سے اخلاقیات، تہذیب اور ادب کی اُمید رکھنا بالکل عبث ہے کیونکہ اس نظام تعلیم کی بُنیاد ہی کمزور ہے اور زندگی کی حقیقت کو واضح کرنے میں بے کار اور بے معنی ہے۔ اقبال مسلمان بچوں کے لیے ایسی تعلیم کے خواہشمند ہیں جس میں دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ دین شناسی کی بھی تاکید ہو۔ فقط روزی روٹی کا بندوبست کرنے والے علوم انسان کی ظاہری دنیا کو آراستہ کرنے کے لیے کافی ہیں لیکن ان کے اندر انسان کی اندرونی دنیا کو متحرک کرنے کا مادہ موجود نہیں ہے۔شاعر اُن جدید مدرسوں سے متنفر ہیں جہاں سے فارغ ہونے والے طلباء اور طالبات خود کو پہچاننے سے قاصر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فقط اُن اہلِ ایمان کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو جسم کے اندر سوز وگداز سے بھرا دل رکھتے ہیں۔

بہ آن مومن خدا کارے ندارد
کہ درتن جانِ بیداری ندارد
از آن از مکتبِ یاراں گریزم
جوانی خود نگہداری ندارد

شاعر ماہرین تعلیم سے تلقین کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو ایسی تعلیم سے منور کریں جو ان کی کائنات کو اندر اور باہر دونوں طرف آراستہ کرے۔ان کو اس

تب وتاب سے روشناس کریں جواُن کی زندگی کو متحرک رکھے۔

تب و تابے کہ باشد جاودانہ
سُمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزندان بیآموز این تب و تاب
کتاب و مکتب افسون و فسانہ

شاعر کے مطابق مسلمان والدین اپنے بچوں کو با مقصد تعلیم دلانے میں ایک اہم رول نبھا سکتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو دین کے ساتھ ساتھ دانش سکھا سکتے ہیں۔ فقط دینی علوم سکھانا یا فقط دنیاوی تعلیم دینا دونوں طرح کی تعلیم بیکار ہے کیونکہ اول الذکر تعلیم انسان کو صرف مذہب سے متعلق جانکاری فراہم کرسکتی ہے اور دنیاوی علوم سے محروم رکھ سکتی ہے جب کہ آخر الذکر تعلیم سے انسان روزی روٹی حاصل کرسکتا ہے لیکن باطنی بینائی نہیں۔ لہٰذا والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو دونوں علوم سے آراستہ کریں۔ ان کو فن اور ہنر کی تربیت کریں کیونکہ ان کے اندر کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی صلاحیت موجود ہے۔

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدستِ اُو اگر داری ہنر را
یدِ بیضا است اندر آستینش

مثنوی کے آخر میں اقبال نے ایک نظم ''خطاب بہ نژادِ نو'' میں اپنے فرزند جاوید سے مخاطب ہوکر مسلمانوں کی نئی نسل کو اپنا پیغام سنایا ہے۔ نئی نسل کو چاہیے کہ وہ ذوق نگاہ اور لا الٰہ الا اللہ کو دل کی گہرائیوں تک اترنے دیں۔ چنانچہ مادہ پرستی اور مغرب پرستی کے طوفانِ بے تمیز نے عقل، سیاست، علم وفن

اور عزم و ارادے کا خون کیا ہے۔ اسی لیے نئی نسل نا اُمید اور پراگندہ ذہن ہے۔

روح چوں رفت از طوات واز صیام
فردنا ہموار و ملت بے نظام!
سینہ ہا از گرمی قرآن تہی
از چنیں مرداں چہ امید بہی!
از خودی مرد مسلمان در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت!

اقبال اس خطاب میں بھی خودی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں کیونکہ خودی کا احساس ہی کامیاب زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ آدمیت احترام آدمی کے مصداق انسانیت زندگی کا جوہر ہے اور دردِ دل دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دردِ دل کے لیے ہی پیدا کیا ہے ورنہ اس کی عبادت کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ نظم کے آخر میں اقبال نے اپنے فرزند کو پیر رومی کو اپنا رہنما بنانے کی تلقین کی ہے تاکہ ان کی رہنمائی میں سوز و ساز اور ذوق وشوق پیدا ہو سکے۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
پائے او محکم فتد در کوے دوست

'پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' اور ''مسافر'' اقبال کی دو مختصر مثنویاں ہیں جو اکٹھے شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر مثنوی کی وجہ تصنیف کے بارے میں

یہ روایت ہے کہ ایک رات مصلح قوم مرحوم سرسید احمد خان اقبال کو خواب میں ملے۔ اس ملاقات کے دوران سرسید نے علامہ سے پوچھا کہ وہ اپنی علالت کا ذکر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی علامہ نے شان رسالت میں شعر گوئی شروع کی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان اور یورپی ممالک کی بگڑتی صورتِ حال کا اجتماعی خاکہ پیش کرنا شروع کیا۔ انگریزوں نے انسانیت کی بے حرمتی کی ہے۔ ہر طرف فرنگی تہذیب وتمدن اور افکار وخیالات کی وجہ سے انسانیت کی روح چیخ رہی ہے اور انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں الجھا ہوا ہے۔ یورپ کے لوگ اپنی موت کا آپ سامان کر رہے ہیں۔ وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں جو اپنوں کا خوف کرنے کے لیے ہمیشہ گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی کج روی کی وجہ سے دنیا بھر میں افراتفری اور بے دینی پھیل چکی ہے ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق؟
باز روشن می شود ایام مشرق
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد
گرگے اندر پوستین برہ
ہر زماں اندر کمین برہ
مشکلات حضرت انسان از اوست
آدمیت راغم پنہاں ازوست

در نگاہش آدمی آب و گل است
کارواں زندگی بے منزل است

یورپ کی ابتر حالی اور مفلوج ذہنیت کی نشاندہی کرنے کے بعد علامہ اقبال نے اہل مشرق کو ان ہلاکت خیز حالات سے محفوظ رہنے کی تلقین بھی کی اور طریقہ بھی بتایا۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں میں اتحاد قائم ہو جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اتحاد کی وجہ سے دنیا کی اہم جنگوں میں فتح و نصرت حاصل کی۔ مسلمان تہذیب اور دین کے امانت دار رہ چکے ہیں۔ اٹھ اے مسلمان! قوموں کے کام میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھول دو خود پر اسلام نافذ کر کے دنیا کی مشکلات کا حل نکال۔

اے امین دولت تہذیب و دیں
آں ید بیضا بر آر از آستیں
خیز و از کار امم بکشا گرہ
نشہ افرنگ را از سر بنہ
نقشے از جمعیت خاور فگن
داستاں خود راز دست اہرمن

مثنوی ''مسافر'' کی وجہ تصنیف کے بارے میں روایت ہے کہ افغانستان کے بادشاہ نادرشاہ نے مذہبی اور تعلیمی امور پر مشورہ کرنے کے لیے علامہ اقبال، سید سلیمان ندی اور سرراس مسعود کو کابل آنے کی دعوت کی۔ قیام افغانستان کے دوران علامہ کو ان برگزیدہ شخصیتوں کے مزار پر جانے کا موقعہ ملا جنہوں نے اپنی خدمات سے مسلمانوں کی تاریخ کو دلچسپ اور اہم بنایا ہے۔ نظم کا آغاز نادرشاہ کی ستائش سے ہوتا ہے۔ وہ درویشوں کی عادت والا

بادشاہ تھا۔ ان کی تدبیر سے ملت کا کام مضبوط ہوا اور ان کی تلوار نے ہمیشہ دینِ اسلام کی حفاظت کی ہے ۔

نادر افغان شاہ درویش خو
رحمت حق بر روان پاک او
کارِ ملت محکم از تدبیر او
حافظ دین مبین شمشیر او

ابتدائی کلمات کے بعد اقبال نے افغانستان کی سرحد پر بسنے والی افغان اقوام سے خطاب کیا ہے۔ افغان ایک بہادر قوم ہے لیکن افسوس یہ قوم قبیلوں میں بٹنے کی وجہ سے پریشان حال ہے۔ جہالت اور تنزلی کی وجہ سے ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگر یہ قوم اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہو جائے گی تو اس میں پھر سے مذہبی حرارت پیدا ہو سکتی ہے۔ دین مصطفیٰ کو گلے لگا کر ہی یہ قوم غالب ہو کر زندہ رہ سکتی ہے ۔

اے ز خود پوشیدہ خود را بازیاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب
رمزِ دین مصطفیٰ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شہنشاہی است
چیست دین؟ دریافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش

نمونۂ کلام

انتخاب از اسرارِ خودی

ساقیا بر خیز و می در جام کن
محو از دل کاوش ایام کن
شعله ی آبی که اصلش زمزم است
گر گدا باشد پر ستارش جم است
می کند اندیشه را هشیار تر
دیده ی بیدار را بیدار تر
اعتبار کوه بخشد کاه را
قوت شیران دهد دوباره را
خاک را اوج ثریا میدهد
قطره را پهنای دریا میدهد
خامشی را شورش محشر کند
پای کبک از خون باز احمر کند
خیز و در جام شراب ناب ریز
برشب اندیشه ام مهتاب ریز
تا سوی منزل کشم آواره را
ذوق بیتابی دهم نظاره را

گرم رو از جستجوی نوشوم
روشناس آرزوی نو شوم
چشم اهل ذوق را مردم شوم
چون صدا در گوش عالم گم شوم
قیمت جنس سخن بالا کنم
آب چشم خویش در کالا کنم
باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سر بسته اسرار علوم
جان اُو از شعله ها سرمایه دار
من فروغ یک نفس مثل شرار
شمع سوزان تاخت بر پروانه ام
باده شبخون ریخت بر پیمانه ام
پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوه ها تعمیر کرد
ذره از خاک بیابان رخت بست
تا شعاع آفتاب آرد بدست
موجم و در بحر او منزل کنم
تا در تابندهٔ حاصل کنم
من که مستی ها ز صهبایش کنم
زندگانی از نفس هایش کنم

❁ ❁ ❁

غزل

نوای من از آن پر سوز و بیباک و غم انگیزست
بخاشاکم شرار افتاد و باد صبحدم تیز است
ندارد عشق سامانی ولیکن تیشهٔ دارد
خراشد سینه کهسار و پاک از خون پرویز است
مرادر دل خلید این نکته از مرد اداادانی
ز معشوقان نگه کاری تر از حرف دلاویز است
ببالینم بیا یکدم نشین کز درد مهجوری
تهی پیمانه بزم ترا پیمانه لبریز است
به بستان جلوه دادم آتش داغ جدائی را
نسیمش تیز ترمی سازد و شبنم غلط ریز است
اشارتهای پنهان خانمان برهم زند لیکن
مرا آنغمزه میباید که بیباک است و خونریزست
نشیمن هر دو را در آب و گل لیکن چه راز است این
خرد را صحبت گل خوشتر آید دل کم آمیز است
مرا بنگر که در هندوستان دیگر نمی بینی
برهمن زاده ئی رمز آشنای روم و تبریز است

❁❁❁

غزل

این جهان چیست صنم خانه ی پندار من است
جلوه ی او گرو دیده ی بیدار من است
همه آفاق که گیرم بنگاهی او را
حلقه ئی هست که از گردش پر گار من است
هستی و نیستی از دیدن و نا دیدن من
چه زمان و چه مکان شوخی افکار من است
از فسون کاری دل سیر و سکون غیب و حضور
این که غماز و گشا ینده ی اسرار من است
آن جهانی که درو کاشته را می دروند
نورو نارش همه از سبحه و زنار من است
ساز تقدیرم و صد نغمه ی پنهان دارم
هر کجا زخمه ی اندیشه رسد تار من است
ای من از فیض تو پاینده نشان تو کجاست؟
این دو گیتی اثر ماست جهان تو کجاست؟

رباعیات

بیا ساقی بیار آن کهنه می را جوان فرودین کن پیردی را
نوائی ده که از فیض دم خویش چو مشعل بر فروزم چوب نی را

❁❁❁

یکی از حجره ی خلوت برون آی بباد صبحگاهی سینه بکشای
خروش این مقام رنگ و بورا بقدر ناله ی مرغی بیفزای

❁❁❁

زمانه فتنه ها آورد و بگذشت خسان رادر بغل پرورد و بگذشت
دو صد بغداد را چنگیزی او چو گور تیره بختان کردو بگذشت

❁❁❁

چو بلبل ناله ی زاری نداری که در تن جان بیداری نداری
درین گلشن که گلچینی حلال است تو زخمی از سر خاری نداری

❁❁❁

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی خودی را فاش تر دیدن بیاموز

❁❁❁

گلہ از سختی ایام بگذار کہ سختی نا کشیدہ کم عیار است
نمی دانی کہ آب جویباران اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است

❁❁❁

چہ خوش گفت اشتری با کرہ ی خویش خنک آن کس کہ داند کار خودرا
بگیر از ما کہن صحرا نور دان بہ پشت خویش بردن بار خودرا

❁❁❁

کبوتر بچہ ی خود را چہ خوش گفت کہ نتوان زیست با خوی حریری
اگر یا ھو زنی از مستی شوق کلہ را از سر شاہین بگیری

❁❁❁

تو ہم مثل من از خود در حجابی خنک روزی کہ خود را بازیابی
مرا کافر کند اندیشہ ی رزق ترا کافر کند علم کتابی

❁❁❁

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مؤلف
۱	کلیاتِ اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری	احمد سروش ایران
۲	ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک لاہور
۳	جاوید نامہ معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۴	اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر عبدالشکور احسن پاکستان
۵	غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خان
۶	حافظ اور اقبال	یوسف حسین خان
۷	شیرازہ اقبال نمبر	جموں و کشمیر کلچرل اکادمی
۸	بانگِ درا معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۹	غزلِ فارسی اقبال	پروفیسر محمد منور، پاکستان
۱۰	زندہ رود	جاوید اقبال پاکستان
۱۱	کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر الف۔دال۔نسیم/ ڈاکٹر غلام جیلانی مخذوم

۱۲	کتابِ دانش	پروفیسر ظہورالدین پاکستان
۱۳	پیامِ مشرق معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۱۴	اقبال اور فارسی شعراء	ڈاکٹر محمد ریاض، لاہور
۱۵	تاریخ حسن جلد دوم	حسن کھویہامی، کشمیر
۱۶	روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف خان
۱۷	اقبال کی تیرہ نظمیں	پروفیسر اسلوب احمد انصاری
۱۸	ارمغان حجاز معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۱۹	بالِ جبریل معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۲۰	اسرارِ خودی معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۲۱	رموزِ بیخودی معہ شرح	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
۲۲	اقبال اصول وافکار	ڈاکٹر تونسوی

رسائل

۱	شیرازہ فروری ۱۹۹۰ء	کلچرل اکادمی جموں وکشمیر
۲	بازیافت اگست ۱۹۹۵ء	شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی
۳	بازیافت مارچ ۲۰۰۲ء	شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی
۴	یغما، اپریل ۱۹۹۸ء	تہران، ایران
۵	یغما، اپریل ۱۹۹۸ء	تہران، ایران

مصنف کی شائع شدہ کتابیں

۱۔ اُردو افسانے میں جنسی نفسیات
۲۔ ورق ورق ادب
۳۔ سرمایۂ اُردو
۴۔ ذخیرۂ اُردو
۵۔ لفظ لفظ اُردو
۶۔ پریم چند کی کہانیوں میں اسلامی تعلیمات
۷۔ اُردو کہانی میں وطنیت اور اتحاد
۸۔ سرمایۂ ادب
۹۔ اُردو افسانے میں جنس نگاری
۱۰۔ حامدی کاشمیری کی افسانہ نگاری

''ڈاکٹر عبدالرشید خان کا شیوہ رہا ہے کہ وہ عموماً ایسے موضوعات پر کتابیں تحریر کرتے ہیں جن کی اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اس سے اُن کے تعمیری ذہن اور جذبۂ خلوص و خدمت کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی سابقہ تصانیف ورق ورق ادب، سرمایہ اُردو، ذخیرہ اُردو اور لفظ لفظ اُردو اسی زمرے کی کتابیں ہیں۔ افادی کتب ہونے کی وجہ سے اُن کی اکثر کتابوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر عبدالرشید کی زیرِ نظر تصنیف بھی شہرت و مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس سے طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ عام قاری بھی استفادہ کریں گے اور دو عظیم شعرا کے نسبتاً کم نمایاں پہلو سے واقف ہو سکیں گے''۔

پروفیسر محمد ظفرالدین

ڈین، اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

''ڈاکٹر عبدالرشید خان کی تحریر کی ایک بڑی خوبی افکار کی معنی خیزی اور طرز نگارش کا غیر مبہم ہونا ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام اسرار و نکات ان کے ذہن میں مکمل طور پر روشن ہیں۔ اس کے جملہ پہلوؤں پر ان کی نظر ہے اور وہ اس کا واضح تصور رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تحریر میں ابہام، تضاد اور تشنگی کی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ یہ یقیناً ایک ایسا وصف ہے جو ان کو مستند ادیبوں کی صف میں جگہ دیتا ہے''۔

پروفیسر شہپر رسول (شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

''ڈاکٹر عبدالرشید خان جو اُردو کے ایک فعال اور متحرک استاد مانے جاتے ہیں، فارسی زبان و ادب پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ خان صاحب نے ''اُردو کے دو عظیم شعراء کی فارسی شاعری'' میں فکری اور فنی دونوں حیثیتوں میں غالب اور اقبال کے درمیان قدر مشترک تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں برگزیدہ شعراء کی شعری وسعتوں کا احاطہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ توقع ہے کہ فارسی شعر و ادب کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوگی''۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی (پروفیسر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی)

Designed by : ZIKRA Printographers, Delhi, Tel.: 91-11-6570 8480

ZIKRA International Publishers

Waheed Kutub Market,
523, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi - 110006
Tel.: 91-11-65708480 Telefax: 91-11-23282395 Fax: 91-11-23251294
E-mail : info@zikraip.com Website : http://www.zikraip.com

ISBN 93-81007-72-1

9 789381 007723